فہرست مضامین

9	تعارف	
11	مسلمانوں کو درپیش مسائل اور اسلامی اعتبار سے ان کا حل	
11	عالم اسلام کی بے بسی کا منظر	
15	مسلمانوں کی زندگی کا اسلام سے وابستہ ہونا	
17	ہمارے مسائل اور ان کی نوعیت و حقیقت	
19	ہمارے مسائل کیا ہیں؟ زندگی کی از سر نو تشکیل کی ضرورت	
21	امت مسلمہ کی حالت زار	
23	اہل اسلام کی زبوں حالی	
24	اہل اسلام کی عزت کا اسلام سے متعلق ہونا	
26	قوموں کو بنانے اور بگاڑنے میں نظام تعلیم کا کردار	
34	بڑا بننے اور فساد پھیلانے کی سزا	
36	دنیاداری سے دنیا پرستی تک	
39	اچھا انسان بننا ہم سب کی ضرورت	
41	نفس پرست افراد سے بچنے کی تاکید	
43	منصب اور لامحدود اختیارات کے نقصانات	

45	جدید آلات۔ دجال اور بچاؤ کی صورت	
47	طاقت کا نشہ شخصیت میں جبر پیدا کرنے کا ذریعہ	
52	فنی مہارت میں برتری وقت کی اہم ضرورت	
54	مقتدر طبقات میں مال بنانے کی روش کا ہونا	
55	اعمال سے غفلت کا مزاج ساری بُرائیوں کا ذریعہ بن سکتا ہے	
56	بندہ مومن کی خاصیت گناہوں سے ڈرتے رہنا	
58	موجودہ دور میں سیکھتے رہنے اور آگے بڑھتے رہنے کے کام سے غفلت کا مظاہرہ ہونا	
60	احساس تنہائی کی بڑھتی ہوئی بیماری	
62	بے خدا تہذیب کے پیدا کردہ مسائل والدین کو بوجھ سمجھنے کی نفسیات	
64	جب انسانی معاشرہ دجل سے عبارت ہو جائے تو دجال کا ظہور ہونا	
66	اقتدار اور دولت کی آزمائش	
67	خیر اور شر کی کشمکش کا جاری رہنا	
69	روحانیت اور نفسانیت کو سمجھنے کی ضرورت روحانیت کے بغیر فرد کا مردہ لاش کی طرح ہونا	
72	آزادی اور غلامی کا فلسفہ (ہماری اپنی ملت کے حالات کی روشنی میں)	

74	ایمان وعقیدہ کی قوت اوراس سے کام نہ لینے کا نتیجہ	
76	نظام کی تبدیلی کی کاوشوں کے ساتھ اصلاح اعمال کی ضرورت	
78	معافی اور درگذری کی صفت کا مفقود ہونا	
79	آداب سے خالی طرز زندگی	
80	برکت کے نظام سے محرومی کا المیہ	
82	اللہ کے سایہ رحمت میں داخل ہونے کی دعوت فکر	
84	بے حسی کی بڑھتی ہوئی صورتحال	
86	فتنوں سے بچنے کی صورت	
87	دجال کا فتنہ ایمان کو سب سے بڑا خطرہ	
92	خیالی قوت کی حفاظت سے پاکیزہ زندگی کا حاصل ہونا	
96	کردار کی روشنی	
98	زندگی میں موجود غیر معمولی خلا اس کو سمجھنے اور پُر کرنے کی صورت	
101	ضد اور اکڑفوں کی نفسیات اوراس کے نقصانات	
105	بندوں کے حقوق غصب کرنے کی روش	
108	خوشگوار زندگی	
111	زندگی کے تین نقطہ نگاہ	
115	خدمت خلق کے کام سے انسانیت کا پیدا ہونا	

117	دوسروں کے عیبوں کو دیکھنے کے بجائے اپنے عیبوں کو دیکھنا	
119	حقیقی بزرگی، تزکیہ، محبت اور روایتی بزرگی	
124	ماتحتوں سے حسن سلوک کی اہمیت	
125	ہماری زندگی کو لاحق مختلف روگ	
128	مادیت کی بے رحم طاقتیں اللہ کا سہارا لئے بغیر چارہ کار نہیں	
130	ایمان کو بچانے کے لئے فکر مندی کی ضرورت	
132	نفس اور روح کے درمیاں کشمکش کی حالت کا ہونا	
134	اہل باطل سے دوستی کا سم قاتل ہونا	
135	بد نظری کے اثرات	
136	فتنے کو جگانے پر انتباہ	
137	اپنی تعریف سے بچنے کا اہتمام ہونا	
138	ایمان کی زیروزبر کی حالت کا ہونا حدیث شریف کی روشنی میں	
140	مال کی خصوصیات اوراس کے مضر پہلو	
142	اللہ کی خاطر گوشہ نشینی اختیار کرنا	
143	خوارج کو سمجھنے کی ضرورت اسلام کے نام پر اسلام سے جداگانہ راستہ	

تعارف

اس وقت دنیا کا لگ بھگ ہر مسلمان پریشان ہے، ایک تو عالمی سرمایہ دار نے مسلمانوں کی معاشی طور پر ناکہ بندی کر رکھی ہے، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی ہر سطح کی قیادت صحیح رہنمائی کرنے کے بجائے وہ دنیاداری اور ذاتی مفادات کی اسیر بن چکی ہے، تیسرے یہ کہ مسلمانوں کا ریاستی نظام جس میں تعلیمی نظام بھی شامل ہے، وہ بے مقصد زندگی کو فروغ دینے کا ذریعہ بن چکا ہے، چوتھے یہ کہ میڈیا کے جدید آلات جو لگ بھگ ہر شخص تک پہنچ چکے ہیں، ان آلات نے ذہنی اور تہذیبی طور پر مسلمانوں کو دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے۔

غرض کہ مسلمانوں کے ایمان ویقین کو کمزور کرنے، اللہ سے دور کرنے اور ان میں اخلاقی اور روحانی خرابیاں پیدا کرنے کے لئے بہت سارے عوامل کارفرما ہیں، جب اخلاقی اور روحانی خرابیاں پیدا ہوں گی اور نفسا نفسی کی حالت غالب ہو گی تو ظاہر ہے اس کے اثرات پست حالی اور فساد کی صورت میں ہی ظاہر ہوں گے، اس طرح اللہ کی مدد اور برکت سے محرومی کی صورت پیدا ہو گی۔

یہ کہنا بجا ہو گا کہ مسلمانوں کے سارے مسائل اور مشکلات اسلام سے دوری کی وجہ سے ہی پیدا ہوئے ہیں، جب تک اللہ سے قریبی تعلق پیدا نہ ہو گا اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی سمت متعین نہ ہو گی، تب تک مسلمانوں کی پست حالی سے نکلنا ناممکن ہو گا۔

اس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام، مسلمانوں کے لئے موت وحیات کا مسئلہ ہے، اسلام سے جتنی زیادہ دوری ہو گی، اسی قدر مسلمانوں کی پست حالی میں اضافہ ہو گا اور کافر قومیں ان پر ٹوٹ پڑیں گی، اسلام اور اسلامی تعلیمات سے جس قدر قربت ہو گی، اسی قدر

وہ سربلند ہوں گے **وانتم الاعلون ان کنتم مومنیں** اس صورت میں اہل کفر کے دلوں میں ان کا رعب ڈال دیا جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں جو مضامین شامل ہیں، ان میں مسلمانوں کے مسائل کا اخلاقی اور روحانی خرابیوں اور اسلام کی دوری کے حوالے سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے، اور بہتر اخلاقی اور روحانی صفات کی تفصیل بیان کی گئی ہے اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ہمارے لئے نافع بنائے۔(آمین)

۴؍دسمبر ۲۰۲۵ء — **محمد موسیٰ بھٹو**

محمد موسیٰ بھٹو

مسلمانوں کو درپیش مسائل

اور اسلامی اعتبار سے ان کا حل

عالم اسلام کی بے بسی کا منظر

اس وقت دنیا کا ہر مسلمان بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنا ہوا ہے، وہ شدید تشویش میں مبتلا ہے کہ معلوم نہیں، اس کے ساتھ اور اس کے دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے، اور وہ کس آفت سے دوچار ہونے والے ہیں، مسلمانوں کی بے بسی کی یہ حالت ایسی ہے، جس سے دل خون کے آنسو رو رہا ہے، اس بے بسی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی سے محرومی کی وجہ سے مسلمان جدید طاقتور ٹیکنالوجی کی حامل قوتوں کے سامنے بے بس ہیں۔

وہ طاقتیں جس طرح چاہتی ہیں انہیں مرعوب اور خوف زدہ کر کے، ان سے اپنے مقاصد حاصل کر لیتی، مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کردار کی رونق سے بھی محروم ہے، ٹیکنالوجی سے محرومی کے ساتھ کردار دسے بھی محروم ہونا، یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے عالمی قوت کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب نکال دیا ہے، وہ انہیں ہر طرح سے پامال کر رہی ہیں۔

جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے خوف زدہ کرنا، یہ اتنا بڑا ہتھیار ہے جو عسکری قوت سے زیادہ طاقتور ہتھیار ہے۔

مسلمان یہ دیکھکر حیران ہو کہ ان کے وسائل ان کے وسائل نہیں رہے، ان کی ریاستی پالیسیاں ان کی نہ رہیں، وہ شدید مہنگائی کا شکار ہیں عالمی قوت عسکری اور فوجی قوت کے بجائے

جدید طاقتور ٹیکنالوجی کے ذریعہ مسلمانوں سے یہ سارے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہے۔

یہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے، مسلمانوں کو سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ ان حالات میں کیا کریں، جس سے ان کے تحفظ کی صورت پیدا ہو اور وہ جدید مادی قوتوں کا شکار ہونے سے بچ جائیں، ٹیکنالوجی کی قوت حاصل کرنے کا وقت تو ضایع ہو چکا، ان حالات سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے کہ مسلمان اپنی بے بسی کی فریاد اللہ سے کریں، اللہ سے مدد مانگیں اور اپنے اعمال کو درست کر کے اللہ کی ذات کو اپنے لئے واحد سہارا بنائیں، اللہ کی ذات بہت بڑی ہے اور وہ کریم ذات بھی ہے، اگر مسلمان اخلاص کے ساتھ اپنے اعمال بد کی اللہ سے معافی مانگیں اور اس کی طرف رجوع ہوں تو حالات کا رخ پلٹ سکتا ہے اور اس وقت خوف زدگی کی جو حالت مسلمانوں پر طاری ہے، وہ اس حالت سے نکل جائیں اور عالمی قوت خود خوف زدگی کا شکار ہو، یہ تبھی ہو سکتا ہے، جب مسلمان اپنے اعمال میں سدھار کی صورت پیدا کریں اور اللہ کی طرف رجوع ہوں۔

خوف زدگی ایک نفسیاتی حالت ہے، مسلمانوں کو اس نفسیاتی حالت سے نکل کر اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنی ہو گی کہ اللہ کی ذات ہمارے ساتھ ہے تو مادی قوت ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے، لیکن یہ خود اعتمادی ایمان کی حالت کو مستحکم کئے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔

عالم اسلام کی بے بسی کا یہ منظر کوئی ایک دن میں پیدا نہیں ہوا، بلکہ یہ عرصے سے ان کی غفلتوں کا نتیجہ ہے، انہوں نے اپنے مادی وسائل بڑی بڑی عمارتوں، عیش و عشرت اور فضول خرچی میں تو صرف کئے، لیکن ٹیکنالوجی کے حصول کے طور پر اپنے آپ کو مستحکم کرنے سے غفلت برتی، انہیں ہوش ہی نہیں رہا کہ اہل کفر انہیں لقمہ تر بنانے کے لئے کوشاں ہیں اور اس کی تاک میں ہیں، نیز مسلمان ہونا، ان کی نظر میں اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا پامال کرنا ہے، قدرت نے انہیں صحیح معنٰی میں مسلمان بننے کے بہت سارے مواقع دیئے، لیکن یہ

سارے مواقع ضایع کر دیئے، یہ غفلت بھی ہے تو عیش و عشرت کا مزاج بھی ہے، اس کی سزا پوری ملت کو مل رہی ہے کہ وہ آج بے بسی کی تصویر بن چکی ہے، ماضی سے سبق سیکھ کر اگر مسلمان حکمران اب بھی بیدار ہوں اور امت کو ساتھ لے کر خدا پرستی اور خود اعتمادی کی راہ پر گامزن ہوں تو وہ مادہ پرست دنیا کی مزاحمت کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اسلام کی سعادت سے بھی بہرہ ور کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کو سمجھنا چاہئے کہ اللہ سے دوری کی سزا صرف آخرت میں ہی نہیں بھگتنی ہو گی، بلکہ اس کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے، اس کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ غیروں کی مرضی کے مطابق چلنا پڑتا ہے اور ان کے احکامات پر سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے اور اپنی خود ارادی اور خود مختاری سے دستبردار ہونا پڑتا ہے، یہ سزا کوئی معمولی سزا نہیں ہے، سمجھنے والوں کے لئے بڑی سزا ہے۔

اللہ کی مخلصانہ اطاعت کی یہ خاصیت ہے کہ غیروں کو نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی ہے، اگر وہ غلطی سے ایسا کرتے ہیں تو انہیں خود اس کی سزا بھگتنی ہوتی ہے۔

اللہ کی مخلصانہ اطاعت ملت کی بے بسی کی حالت کو ختم کر کے ان کو سرفرازی عطا کرتی ہے، اب یہ ملت کا کام ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کے مطابق زندگی گزار کر خود رائی اور خود مختاری چاہتی ہے یا غیروں کی بالادستی۔

ملت کو ان دونوں میں سے ایک ہی راہ اختیار پڑے گی۔

قومی وسائل کو عسکری اور ٹیکنالوجی کے حصول کے طور پر مستحکم کرنے کے لئے استعمال کریں، مقتدر طبقات کے اسراف یعنی عیش و عشرت پر وسائل صرف کرنے پر پابندی عائد کریں، اپنی نسلوں کی تربیت میں نظریاتی پختگی اور ایمان و یقین کے استحکام کا خصوصی اہتمام کریں۔

مسلم ممالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی جملہ ضروریات کے بارے میں خود کفیل ہوں، دوسروں کی محتاجی سے بچیں، افراد کے بجائے اداروں کو مضبوط کریں، ملت کی وحدت

کو پیش نظر رکھیں، مسلمان کی حیثیت سے کمزور مسلم ممالک کی خوب مدد کریں، جو مسلمان ممالک عالمی مالیاتی اداروں کے مقروض ہیں، ان کا قرضہ اتاریں، یہ اسلامی برادری کی حیثیت سے ان کا اخلاقی فریضہ ہے، اہل کفر سے کسی بھی صورت میں خوف زدہ نہ ہوں، ہر معاملے میں اپنی عوام کو ساتھ لے کر چلیں، اور مسلم معاشرہ کی دینی اعتبار سے تربیت کا بہتر سے بہتر اہتمام۔ عالم اسلام کا اصل کام تو یہ تھا کہ وہ اہل کفر تک اسلام کی دعوت پہنچائیں، تاکہ ان کے لئے آخرت کے دائمی عذاب سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے کردار کی روشنی کے ساتھ ساتھ اہل کفر کے مراکز میں علمی اداروں کو مستحکم کرنا چاہئے تھا، لیکن یہی وہ کام ہے جو نہیں ہو رہا ہے، شاید اس کی سزا ہے کہ اہل کفر عالم اسلام کو اپنے زیر نگیں رکھنے میں کامیاب ہوا ہے اور عالم کفر زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ تمہارے پاس توحید خالص کی جو پاکیزہ تعلیمات موجود ہے، وہ تم نے ہم تک نہیں پہنچائی اور ہمیں دائمی عذاب سے دوچار کر دیا، تم اس کی سزا بھگتو کہ دنیا میں تمہاری باگ ہمارے حوالے ہے، تم ہر معاملے میں ہمارے محتاج ہو۔

عالم اسلام اگر ایمان سے محروم دنیا کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرے تو نہ صرف یہ کہ ان پر عالمی طاقت کی خوف زدگی کی فضا ختم کر دی جائے گی، بلکہ ان کو مزید نعمتوں سے نوازا جائے گا اور دنیا میں طاقت کا جو توازن اہل کفر کے حق میں ہو گیا ہے، وہ توازن ختم ہو کر مسلمانوں کے لئے نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہو جائے گا۔

اللہ کا وعدہ برحق ہے **(وانتم الاعلون ان کنتم مومنین)** اللہ کے وعدے پر بھروسہ کرنا ہے، مومنوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ غیروں تک حق و صداقت کا پیغام پہنچائیں اور انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرائیں، ہم نے یہ جو کچھ لکھا ہے وہ محض وعظ و نصیحت نہیں ہے، بلکہ اصولوں پر مشتمل چیزیں ہیں۔

مسلمانوں کی زندگی کا

اسلام سے وابستہ ہونا

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی زندگی اسلام اور اسلامی تعلیمات سے وابستہ ہے، اسلام وہ دستور العمل ہے، جو اللہ کی طرف سے عطا فرمایا گیا ہے، قرآن وسنت میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے، اسلام سے ہٹ کر زندگی ناکامیوں سے ہی دوچار ہوگی، اگر مادہ پرست قوموں کی طرح مسلمانوں کو مادی طور پر خوشحال زندگی پوری طرح حاصل بھی ہو جائے تو اسلام سے ہمہ آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے ایک تو وہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے بہت ساری خرابیوں سے عبارت ہوگی دوسرے یہ کہ یہ زندگی خیر وبرکت سے محروم ہوگی۔

عقلیت پرستی اور مادیت پرستی والی زندگی ایسی ہے جو افراد کی داخلی زندگی میں ہیجان برپا کر دیتی ہے، اور انسان کو محبت سے محروم کر کے، باہمی طور پر ایک دوسرے سے تناؤ کی حالت میں رکھنے کا باعث بنتی ہے، جب کہ اسلام محبت کے جذبات کو ابھار کر ایک دوسرے سے خیر سگالی پیدا کر دیتا ہے۔

زندگی کا کون سا پہلو ہے، جس کے بارے میں اسلام کی تعلیمات نہ ہو، اسلام روزی کے لئے ہونے والی جدوجہد کو فرض قرار دیتا ہے، اسلام گھر اور خاندان کو مستحکم کرتا ہے، اسلام، انسانوں کو اللہ کا کنبہ قرار دیتا ہے، جو اللہ کے کنبے کے لئے بہتر ہے، وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے، اسلام مسلمانوں کو ملت واحدہ قرار دیکر، ایک دوسرے کے درد میں شریک ہونے اور اہل کفر کی جارحیت کے مقابلے میں متحدہ ہو کر لڑنے کی تعلیم دیتا ہے، اسلام جہاد کے لئے سازوساماں کو تیار رکھنے کی ہدایت کرتا ہے، اسلام غیر مسلموں کو جبراً اسلام قبول کرنے سے منع کرتا ہے، اسلام دنیا میں امن قائم کرنے کا علمبردار ہے، اسلام، سیاست اور زندگی کے ہر شعبے میں آداب واخلاق کو پیش نظر رکھنے کی تعلیم دیتا ہے، اسلام، اللہ کی عبادت کر کے پوری انسانی شخصیت کو حالت سکون اور حالت توازن میں رکھتا ہے، اسلام روح اور روحانی قوت کو

نفس اور نفسانی قوت پر غالب رکھتا ہے۔ اسلام مادیت کی دوڑ میں زیادہ شریک ہونے سے روکتا ہے۔

اسلام معافی کی تعلیم دیتا ہے، حق تلفی اور نقصان پہنچنے کے باوجود دوسروں کو معاف کرنے کو اعلیٰ درجے کی نیکی قرار دیتا ہے، اسلام مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے جہاں مادی وسائل کو اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے، وہاں اللہ سے اپنے تعلق کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے کی تعلیم دیتا ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسانیاں پیدا کرتا ہے، اسلام اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے کو بہت بڑا گناہ قرار دیتا ہے۔

غرض کہ اسلام کی تعلیم ہمہ جہتی ہے اور پوری زندگی پر حاوی ہے، اس لئے مسلمانوں کے مسائل کا مطلب دینی اخلاقی اور روحانی نوعیت کے مسائل ہیں، مسلمان دینی اخلاقی اور روحانی طور پر صحیح ہوگا اور تقویٰ کا صاحب ہوگا تو اس کے لئے زمین وآسمان کی رحمتوں کے (دروازے) کھول دیئے جائیں گے (قرآن یہی کہتا ہے)۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر صحیح معنیٰ میں مسلمان ہو جائے تو وہ اللہ کی ضمانت میں آجاتا ہے (الیس اللہ بکاف عبدہ) اور وہ اہل کفر کے مقابلے میں سیسہ پلائی دیوار بن جاتا ہے۔

آج مسلمانوں کو درپیش سارے مسائل اس کی دینی زندگی کی کمزوری بلکہ دین سے دوری ہی کا نتیجہ ہیں، ایمان پر محنت نہیں ہے، اللہ کی ذات پر یقین نہیں ہے، اللہ کی محبت سے زیادہ دنیا کی محبت غالب ہے، عبادت سے ذوق وشوق کی حالت نہیں ہے، ایک دوسرے سے کدورت کی فضا موجود ہے۔

اس طرح کی خرابیوں کی موجودگی میں ہمارے مسائل کے حل کی صورت کیسے پیدا ہوسکتی ہے، اس صورت میں مسائل سنگین سے سنگین تر ہوتے جائیں گے، غور وفکر کی ضرورت ہے اور اپنے آپ کو بدلنے کی بھی۔

ہمارے مسائل

اوران کی نوعیت وحقیقت

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو درپیش مسائل ومشکلات اسلام سے دوری ہی کا نتیجہ ہیں، اسلام سے جتنا تعلق کم ہوگا، اسی قدر مسائل اوران کی شدت میں اضافہ ہوتا جائے گا، اسلام اور اسلامی تعلیمات سے تعلق جتنا بڑھے گا، اسی قدر مسائل حل ہوتے جائیں گے، حدیث شریف ہے جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے، ایمان ویقین کی پختگی اور اللہ سے مستحکم تعلق ایسی چیز ہے، جس سے فرد کی شخصیت میں استحکام اور ٹھہراؤ آجاتا ہے، غم پر کنٹرول ہوتا ہے، دوسروں کی دل آزاری سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، اللہ کے بندوں سے محبت پیدا ہوتی ہے، روزی کی جدوجہد میں غیر معمولی برکت ہوتی ہے ہر شعبے سے وابستہ افراد میں احساس ذمہ داری پیدا ہو جاتی ہے، اللہ کی طرف سے غیروں کے دلوں میں رعب ڈال دیا جاتا ہے، صبر، ضبط اور نرمی اور شفقت کا مزاج پیدا ہوتا ہے، ان خوبیوں، اوصاف اور ان اعمال کے فقدان سے ہی تو زندگی میں مسائل پیدا ہوتے ہیں، جس سے افراد بحران کا شکار ہوتے ہیں اور مشکلات احاطہ کر لیتی ہیں۔

اللہ نے اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ذریعے مسلمانوں کو مسائل اور مشکلات سے بچاؤ کی ضمانت لی ہے، یہاں اس سلسلے میں صرف ایک حدیث پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کا مقصود دنیا ہو (یعنی مال ودولت ہو) اللہ اس کے کام بکھیر دیتا ہے اور اس کا فقر اس کے سامنے کر دیتا ہے، حالانکہ اسے دنیا اتنی ملنی ہے جتنا اس کا مقدر ہے، اور جس کی نیت (یعنی مقصود) آخرت ہو، اللہ اس کے کام بنا دیتا ہے، اور اس کے دل میں استغنا (یعنی دنیا سے بے نیازی کی حالت) پیدا کر دیتا ہے، اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے۔''

ہماری انفرادی واجتماعی زندگی میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں، جس کی وجہ سے ہم مسائل میں الجھ گئے ہیں اور مسائل نے ہماری زندگی دوبھر دی ہے ان مسائل کی نشاندہی ہونا ضروری ہے۔

ہمارے جو مسائل دنیاوی نوعیت کے ہیں، وہ بھی دراصل اللہ اور دین سے دوری کا نتیجہ ہیں۔

اور دین کی پاکیزہ تعلیمات سے دوری نے یہ سارے مسائل پیدا کئے ہیں، سندھ کے ایک بہت بڑے عارف اور صوفی شاعر نے تو یہاں تک کہا ہے کہ محبوب حقیقی سے محبت کے بغیر یہ دنیا دوزخ کا دھواں ہے، دوزخ کے دھوئیں کی خاصیت جلانا ہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اللہ کے ساتھ وفاداری کے رشتے میں منسلک ہو جائے اور اپنی زندگیوں کو اسلام سے ہم آہنگ بنالے تو اسے دوسرے بکھیڑوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں، اللہ اس کے کام بناتا جائے گا، اور اس کی حفاظت فرماتا رہے گا۔

جب ایسا نہیں ہوگا تو مسائل کا ایسا پٹارا کھلتا جائے گا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے گا، پھر افراد ان مسائل کی آگ میں جلتے ہی رہیں گے۔

مسائل کی ایک نوعیت تو یہ ہے کہ وہ اللہ سے دوری اور اعمال کی سزا ہوتی ہے۔

مسائل ومشکلات کی دوسری نوعیت یہ حکمت ہوتی ہے کہ بندے کے لئے گناہوں سے معافی کی صورت پیدا ہو، اس میں اللہ سے مانگنے کی نفسیات پختہ ہو اور دینی اعتبار سے شخصیت میں، استحکام پیدا ہو اس سلسلے میں ایک حدیث شریف بھی ہے۔

فرمایا، اس بندے میں کوئی خیر نہیں جس کا مال ضایع نہ ہو، جو بیمار نہ ہو، جب اللہ تعالیٰ کسی کو محبوب رکھتا ہے تو اسے مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے اس طرح اسے صابر بنا دیتا ہے۔

یعنی یہ تکلیف صبر پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔

ہمارے مسائل کیا ہیں؟
زندگی کی از سر نو تشکیل کی ضرورت

ہمارا سب سے بڑا مسئلہ اللہ سے مستحکم تعلق کا نہ ہونا ہے، جس کی وجہ سے شخصیت پر نفس کا دیو غالب ہونے لگتا ہے اور وہ اسے اللہ سے سرکشی اور بندوں کی حقوق تلفی کی راہ پر لے جاتا ہے، جس سے معاشرے میں سارا فساد پیدا ہونے لگتا ہے، اور فرد گناہوں میں اتنا جری ہونے لگتا ہے کہ گناہ اس کے مزاج کا حصہ بننے لگتے ہیں، اگر فرد میں طاقت موجود ہے تو وہ دوسروں پر ظلم و ستم بھی کرنے لگتا ہے، اللہ سے تعلق کمزور ہونے سے فرد کا اپنے اعضائے جوارح پر کنٹرول نہیں ہو پاتا اور وہ معاشرے میں فساد برپا کرنے لگتا ہے، قومی اور اجتماعی نوعیت کے ہمارے جتنے بھی مسائل ہیں، وہ سب اللہ کو بھلانے اور اپنی باگ اپنے نفس کے حوالے کرنے کا نتیجہ ہوتے ہیں، ظلم و ستم ہو، رشوت ہو، لوٹ مار ہو، قتل ہو، دوسروں کی تذلیل ہو، اپنے آپ کو بلند مقام پر فائز سمجھنا ہو، قطع تعلقی ہو، جھوٹ ہو، فریب ہو، ضد اور اکڑ فون ہو، دھوکہ دہی ہو، ملاوٹ ہو، مہنگائی ہو، غرض کہ یہ سارے مسائل اللہ سے دوری کے نتیجے میں ہی پیدا ہوتے ہیں، اس سے فرد جرائم میں جری ہو جاتا ہے، جب اللہ سے گہرا اور مستحکم تعلق پیدا ہوتا ہے تو اس سے اللہ کی خشیت کا احساس غالب ہونے لگتا ہے اور گناہوں، سرکشی، حق تلفی اور ظلم و ستم کے بارے میں حساسیت بڑھنے لگتی ہے کہ جب مجھے اللہ دیکھ رہا ہے تو میں گناہ کیسے کروں، پھر مجھے اللہ کے ہاں ہر گناہ کی جواب دہی بھی تو کرنی ہے، اس طرح آخرت میں سخت سزا سے دوچار ہونا ہے۔

یہ احساس ایسا ہے جو فرد کو اللہ سے سرکشی اور بندوں کی حقوق تلفی کے بارے میں سخت حساس بنا دیتا ہے، ایسا فرد حق تلفی، دھوکہ دہی اور ظلم و ستم کرنے سے کانپنے لگتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے سارے مسائل کی جڑ بنیاد اللہ کو فراموش کرنا اور اس ہستی سے دوری ہی ہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ معاشرہ فساد سے محفوظ ہو، دوسروں کے بارے میں ہمارا رویہ ظالمانہ ہونے کے بجائے منصفانہ بلکہ محبت پر مبنی ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر ایسا نظام تشکیل دیں، جس سے ہمارا اللہ سے تعلق مستحکم سے مستحکم تر ہو، اس کے بغیر نہ تو ہم مسائل کی سنگینی سے بچ سکتے ہیں اور نہ ہی نئے نئے پیدا ہونے والے بحرانوں سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔

اللہ کی خشیت اور اللہ کی محبت سے محرومی فرد کو قساوت قلبی اور سنگ دلی کا شکار بنا دیتی ہے اور فرد کی شخصیت میں حیوانیت کے اجزاء داخل کر دیتی ہے، اس نکتے کو سمجھکر ہمیں اپنی زندگی کی از سر نو تشکیل کرنی ہو گی۔

اللہ سے تعلق مستحکم کرنے کے لئے تعلیمی اداروں سے کام لینا ہو گا، تربیت کے اداروں کو مستحکم کرنا ہو گا، اہل اللہ کے لئے کام کرنے کے لئے حالات کو سازگار بنانا ہو گا، مغرب سے اٹھنے والی نظریاتی اور فکری یلغار کو روکنا ہو گا، ملک اور قوم کو معاشی طور پر خود کفیل بنانا ہو گا (تاکہ غیروں کے ہر طرح کے دباؤ سے محفوظ ہو سکیں) سادگی سے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھنا ہو گا، جدید ٹیکنالوجی کو ترقی دینا ہو گی (جس سے غیروں کی محتاجی سے بچنے کی صورت پیدا ہو گی)۔

امت مسلمہ کی حالت زار

اس وقت مسلم امت کے حالات اچھے نہیں ہیں، لگ بھگ، امت کا ہر فرد پریشان ہے، امت کی حالت زار کے اسباب پر نظر ڈالی جائے تو کچھ اسباب اس طرح ہیں، • قیادت کا بحران ہے، جس نے امت کو دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے، ہر جگہ بادشاہت اور آمریتیں مسلط ہیں، ان آمریتوں کو امت کے مسائل کے بجائے اپنے اقتدار اور مفادات سے ہی دلچسپی ہے، اس کے علاوہ کوئی فکر لاحق نہیں۔

یہ قیادت عالمی سطح پر عالمی شاہوکار کے زیر دست ہے، قیادت کے بحران نے امت کو عالمی کفر کے لئے لقمہ تر بنادیا ہے۔

مادیت کی عالمگیر فضا نے امت سے وابستہ افراد کو ذہنی طور پر اسلام پر یقین کی حالت کو کمزور کر دیا ہے اور عملی طور پر دنیاداری کی راہ پر گامزن کر دیا ہے •امت میں اسلامی تحریکیں اور علمائے کرام موجود ہیں جو اپنی حد تک احیائے اسلام کے لئے کام کر رہی ہیں، لیکن مادیت کا سیلاب اتنا بڑا اور طاقتور ہے کہ افراد امت کو اس سیلاب سے بچانے کی کاوشیں کم ہی نتیجہ خیز ہیں، اس لئے کہ ریاست کی قوت ان کے ہمنوا نہیں۔

اہل کفر کے ساتھ وسائل کی بہتات بھی ہے، جدید میڈیا کے طاقتور آلات بھی تو طاقتور تنظیم بھی۔ جب کہ امت مسلمہ کو مادیت کے سیلاب سے بچانے والے مصلحین اس اعتبار سے کمزوری کا شکار ہیں، بالکل وہ حالت ہو گئی ہے جو ایک حدیث شریف میں بیان ہوئی ہے کہ اسلام کی شروعات غربت (یعنی اجنبی حالت) میں ہوئی اور آخر میں پھر اسلام حالت غربت یعنی اجنبی ہو جائے گا، آپ نے مزید فرمایا غریبوں کے لئے خوشخبری ہو۔

اس حدیث شریف میں آخری دور میں اہل اسلام کی حالت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، اس سے بہتر نقشہ کھینچا ہی نہیں جاسکتا۔ اسلام سے وابستہ افراد یا اسلامی دعوت کا کام کرنے والے

صاحبان جو اکثر غرباہی کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے خوشخبری سنائی ہے کہ یہ سعادت عظمیٰ انہی کے حصہ میں آئی ہے کہ وہ آخری دور میں ہر اعتبار سے تہی دستی کے باوجود اسلام پر عمل پیرا بھی ہیں تو ساتھ ساتھ اس کی دعوت کے کام کے لئے کوشاں بھی۔

ایک حدیث شریف میں امت سے وابستہ افراد کی مثال جسم سے دی گئی ہے کہ جسم کے جس حصہ کو بھی تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم اس کی اذیت محسوس کرتا ہے، دوسری حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جسے مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی نہیں ہے، یا مسلمانوں کی فکرمندی نہیں ہے، وہ ہم میں سے نہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ میں وقفہ کے ساتھ ایسی شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں جو اہل اسلام میں بیداری کی تحریک پیدا کر کے، ان کے زوال کو دور کرنے اور ان کے لئے رجوع اللہ کا ذریعہ بنتی رہی ہیں، لیکن موجودہ دور میں اس طرح شخصیت بھی ظاہر نہیں ہو رہی ہے حالانکہ اہل اسلام کا موجودہ دور جیسا زوال اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ امید کی جارہی ہے کہ ان شاء اللہ جلد ہی امام مہدی کا ظہور ہو گا جو مسلمانوں کو منظم کر کے جذبہ جہاد کے ذریعہ وہ ان میں نئی روح پھونکنے کا باعث بنے گا، اس طرح مسلمانوں پر اہل کفر کے زور ٹوٹنے کی سبیل پیدا ہو گی۔

اہل اسلام کی زبوں حالی

موجودہ دور میں اہل اسلام کی زبوں حالی دیکھکر ہر درد مند فرد رنجیدہ اور افسردہ ہے، یہ زبوں حالی کسی ایک پہلو سے نہیں ہے، بلکہ لگ بھگ ہر پہلو سے ہے، دینی، اخلاقی، روحانی، غیروں سے ذہنی مرعوبیت، اپنے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت سے محرومی، قدرت کی طرف سے دیئے ہوئے وسائل کے صحیح استعمال کی عدم صلاحیت اور اپنے دفاع کے لئے عسکری قوت کی تیاری سے غفلت وغیرہ، غرض کہ اہل اسلام کی زبوں حالی ہر اعتبار سے قابل رحم ہے۔

یہ صورتحال ایک دن میں پیدا نہیں ہوئی، بلکہ برسوں کی غفلت کا نتیجہ ہے، اس زبوں حالی کی دنیاوی زندگی پر جو اثرات پڑ رہے ہیں، وہ تو ظاہر ہیں کہ عالمی سطح پر ان کی حیثیت اور قوت نہ ہونے کے برابر ہے اور ان کی آواز کسی قابل ہی نہیں ہے، لیکن آخرت میں اپنے ان اعمال بد کی جو سزا بھگتنی ہوگی، وہ ہولناک سزا ہے، آخرت کی زندگی کوئی زیادہ دور بھی نہیں ہے، بہت قریب ہے، حد سے زیادہ قریب، **وما امر الساعة الا كلمح البصر او هو اقرب** (وہ گھڑی (قیامت) واقع ہوگی آنکھ جھپکنے میں بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب)۔

دوسری جگہ ہے **ويوم تقوم الساعة يقسم المجرمون ما لبثو غير ساعة** (جس دن قیامت برپا ہوگی تو گناہ گار قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہم دنیا میں نہ رہے تھے مگر ایک گھڑی)۔

مسئلہ کسی ایک آدھ فرد کا نہیں ہے، مسئلہ اہل اسلام کی اکثریت کا ہے کہ وہ اس دنیا سے زیادہ آخرت میں شدید خطرات سے دوچار ہے، بیداری اور فکر مندی کی ضرورت ہے، یہ حالات جن اسباب کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ اسباب یہ ہیں • اپنی اصلاح اور ایمان ویقین کی حالت بہتر بنانے سے غفلت • روحانی اور اخلاقی تربیت کے نظام کا فقدان • مادی نظریات سے مسحور اور متاثر ہونا • خود احتسابی کے فقدان کا ہونا • اسلامی تعلیمات واحکامات سے بے پرواہی وبے نیازی کا ہونا • تعلیمی نظام کا اسلام سے ہمہ آہنگ نہ ہونا • دنیا سے محبت ہونا • جذبہ جہاد کا نہ ہونا وغیرہ۔

ضرورت ہے کہ ان خرابیوں سے بچکر اپنی زبوں حالی کو دور کیا جائے اور اللہ سے قریب ہو کر اللہ کی مدد کا مستحق ہوا جائے اور خود اہل دنیا واہل کفر کی بھی آخرت کی زندگی اور وہاں کے عذاب الیم سے بچاؤ کے لئے ان کی رہنمائی کی جائے۔

اہل اسلام کی عزت کا اسلام سے متعلق ہونا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ عربوں کو اسلام سے عزت ملی ہے، اگر انہوں نے اسلام (اسلامی تعلیمات) کو چھوڑ دیا تو وہ ذلیل ہوں گے۔

حضرت عمر کا یہ قول محض عربوں سے لاگو نہیں ہوتا، بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں پر بھی لاگو ہوتا ہے کہ صدیوں سے انہیں دوسری قوموں پر جو برتری حاصل تھی، وہ اسلام کی وجہ سے تھی، جب انہوں نے اسلامی تعلیمات کو غیر اہم سمجھنا شروع کیا اور رسمی دینداری تک محدود ہو گئے تو وہ زوال کا شکار ہوئے، زوال کی یہ حالت مسلسل بڑھتی ہی جارہی ہے۔

اسلام اور اسلامی تعلیمات میں ایسی خصوصیات اور شان وشوکت ہے کہ جو قوم بھی اسے اپنائے گی اور دل وجان سے اس پر عمل پیرا ہوگی، اسے دنیا میں بھی عزت اور سرفرازی حاصل ہوگی تو آخرت میں تو اسے جنت کی صورت میں عظیم الشان کامیابی نصیب ہوگی۔

مسلمانوں کی کامیابی کا اسلام سے وابستہ ہونا اور پوری دنیا پر اہل اسلام کا چھا جانا، یہ ایسی بات ہے، جسے عالمی اقتدار کا حامل طبقہ پوری طرح سمجھتا ہے، انہیں اس بات کا یقین ہے کہ اگر مسلمانوں کو فکری اور عملی بگاڑ سے محفوظ رکھا گیا اور اسلام پر ان کے یقین کو مضبوط کرنے کا موقعہ دیا گیا تو پھر ہماری تہذیبی برتری اور دنیا پر ہمارا عروج باقی نہ رہے گا، چنانچہ ایک عرصے سے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کوششیں ہو رہی ہیں کہ مسلمان کو حقیقی مسلمان رہنے نہ دیا جائے، ان سے ان کی پاکیزہ تہذیب کو سلب کیا جائے۔

یہ ہمارا المیہ ہے کہ پوری دنیا مادیت پسندی کی یلغار کا اس طرح شکار ہے کہ روح اسلام، جذبہ جہاد، حمیت دین اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ مفقود ہے، یہی نہیں بلکہ مسلمان ممالک کے مقتدر طبقات کی بڑی تعداد سیکولر فکر کی حامل ہوگئی ہے، وہ مغرب اور مغربی تہذیب سے نہ صرف خوف زدہ ہے، بلکہ ذہنی طور پر اس سے شدید مرعوب بھی ہے۔

چونکہ مسلمان ممالک کا اقتدار اور ریاست کے کل وسائل اور ذہن سازی کے ادارے حکومتوں کے پاس ہیں، حکومتیں سیکولر فکر کی حامل ہونے کی وجہ سے ریاستی اداروں کو اسلامی فکر کو پروان چڑھانے اور اسلامی تربیت کا ماحول پیدا ہونے نہیں دیتی۔

مسلم دنیا جو آج کل شدید مسائل ومشکلات کا شکار ہے، اس کا بنیادی سبب یہی ہے، ورنہ اللہ کا وعدہ ہے کہ اگر تم مومن ہوگے تو برتری تمہیں ہی حاصل ہوگی۔ **(وانتم الاعلون ان کنتم مومنین)**۔

قوموں کو بنانے اور بگاڑنے میں
نظام تعلیم کا کردار

قوموں کو بنانے اور بگاڑنے میں تعلیم کا کردار سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے، تعلیم میں اگر خدا پرستی پر مبنی نظریہ کی روح شامل ہو، تو اس طرح کی تعلیم سے خدا سے محبت کرنے والے افراد پیدا ہوتے ہیں، جو قومی اور ملی زندگی کے ہر شعبے کی تعمیر و تشکیل میں اس نظریے کے تقاضوں کو شامل کرتے ہیں، اس طرح کی تعلیم سے ایسے اہل سیاست ایسے آفسران اور ایسے اہل تجارت وغیرہ تیار ہوتے ہیں، جو اللہ کی محبت کے زیر اثر اپنے مفادات سے دستبردار ہو کر، ملت کی تعمیر کا کارنامہ سرانجام دیتے ہیں، ایسی تعلیم قوموں کے لئے سرمایہ حیات ہوتی ہے اور انہیں بلند کرنے کا ذریعہ بھی۔ لیکن اس تعلیم کا تقاضہ اسلامیت کے ایک آدھ کتاب کے شامل ہونے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ سارے نصاب تعلیم کو اللہ کی شان عظمت سے سرشار کرنے سے وابستہ ہوتا ہے، چونکہ اللہ قادر مطلق ہستی ہے۔ ساری کائنات کی خالق ہستی ہے، ساری اشیائے کائنات اس کی تعریف و تسبیح کرتی ہے، سارے علوم اسی کے پیدا کردہ ہیں، اس لئے نصاب تعلیم میں اس کی روح کو شامل کرنے سے ایسے افراد تیار ہوتے ہیں، جو اللہ اور اس کے بندوں سے وفاداری کے رشتے میں منسلک ہوتے ہیں، وہ صاحب کردار ہوتے ہیں، اللہ کی محبت ان کی زندگی کے ہر پہلو سے نمایاں ہوتی ہے، وہ اللہ کی مخلوق کی بھلائی اور ان کے مفاد کو اپنا مفاد سمجھتے ہیں۔

اس طرح کے نظام تعلیم ہی سے قومیں ہر طرح کے بحرانوں سے بچ جاتی ہیں۔

سارے علوم وفنون کی اصل آکر جہاں پہنچتی ہے، وہ اللہ کی وحدانیت ہے، یعنی سارے علوم وفنون اللہ کی وحدانیت کے مظہر ہیں، ان علوم کی ساخت میں اپنے خالق کی معرفت اور اس کی روح موجود ہے، اس لئے ان علوم کو جب اللہ کی وحدانیت کے مرکزی نکتے کے تحت

پڑھا جائے گا تو اس سے اللہ کی شان عظمت کے زیر اثر اللہ کی محبت پیدا ہو گی اور اللہ کی محبت فرد کو ساری زندگی اللہ کی اطاعت کے دائرے میں رکھے گی اور اطاعت کے دائرے سے باہر جانے نہیں دے گی۔

علوم کا حاصل اللہ کی شان عظمت کا غلبہ ہے، اور اس کا نتیجہ اللہ سے والہانہ محبت ہے۔

تعلیم کا دوسرا نظام عقلیت پرستی اور مادیت پرستی پر مبنی ہوتا ہے یا مادیت پرستی پر مبنی نظریات سے ماخوذ ہوتا ہے، اگر مسلمان اپنے پاکیزہ نظرئے سے اعراض کر کے اس طرح کے نظام تعلیم کو اپنا حصہ بناتے ہیں تو اس سے اسلام اور اسلامیت کی روح سے بے بہرہ اہل سیاست، افسران اور اہل تجارت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں، جو اپنے مفادات اور حرص وہوس کے جذبات کی وجہ سے قومی وملی زندگی کو زیر وزبر کرنے اور اپنے کردار سے انہیں نئے نئے بحرانوں سے دوچار کرنے کا باعث بنتے ہیں، اس طرح کا نظام تعلیم دل اور روح کو فاسد بنانے کا ''کارنامہ'' سرانجام دیتا ہے، ایسی قوم کا نظام تعلیم ہی ان کے زوال اور پستی کے لئے کافی ہوتا ہے۔

تعلیمی نظام اگر اسلامی نظرئے سے ہمہ آہنگ نہ ہو تو اس سے جو نقصانات ہوتے ہیں، وہ کچھ اس طرح ہیں۔

• قومی وحدت کا عمل متاثر ہوتا ہے • لسانی اور علاقائی قومیتوں کو سر اٹھانے کا موقعہ ملتا ہے • اقتدار کی جنگ تیز ہوتی ہے • مختلف طبقات میں رسہ کشی کی حالت شروع ہو جاتی ہے • مقتدر طبقات کا غلبہ ہونے لگتا ہے • ہر لسانی وعلاقائی قومیت اپنے ساتھ ظلم وزیادتی کا رونا رونے لگتی ہے • طاقتور طبقات کو کمزوروں پر تسلط جمانے کا موقعہ ملتا ہے • فکری انتشار بڑھنے لگتا ہے • انفرادی اور اجتماعی زندگی خلفشار سے شکار ہونے لگتی ہے • جس کو جہاں بھی مال کمانے کا موقعہ ملتا ہے، وہ بے دریغ مال کمانے لگتا ہے، کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوتا •

قوم میں بے بسی اور بے کسی کی حالت پیدا ہونے لگتی ہے • سب سے بڑی بات یہ کہ خدا کی مدد رخصت ہونے لگتی ہے • منتشر ذہن کے افراد تیار ہونے لگتے ہیں۔

یہ سارے نقصانات اس لئے ہوتے ہیں کہ قوم کی تربیت کرنے والا سب سے بڑا ادارہ قوم کی تربیت سے قاصر ہوتا ہے، اس طرح قوم سے وابستہ افراد نفس پرستی اور مادہ پرستی کی قوتوں کے حوالے ہو جاتے ہیں اور وہ اللہ سے دور سے دور تک ہونے لگتے ہیں، اللہ سے دور ہونے والے افراد کو اللہ مزید دور کرنے لگتا ہے۔

اسلام سے بے پرواہی کی روش اگر اسلام کا نام لینے والے افراد کریں گے تو ان کو دوسروں کے مقابلے میں اس کی زیادہ سزا ملتی ہے۔

ہم یہاں نظام تعلیم کے حوالے سے ملت کی تین ممتاز اور بلند پایہ شخصیتوں کی تحریروں کے اقتباسات پیش کرتے ہیں، تاکہ اس موضوع کی اہمیت اجاگر ہو۔

علامہ اقبال لکھتے ہیں۔

''مجھے رہ رہ کر یہ رنج اور تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے، روحانی طور پر ایک بے جان لاش کے ہے، اور اگر موجودہ صورتحال بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علمبرداروں کے قالب میں، ابھی تک زندہ ہے ہماری جماعت (قوم) کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی، وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہونا چاہئے، وہ ہمارے مقابلے میں ہماری قوم کی ماہیت اور نوعیت سے بہت زیادہ واقف تھے۔ (بحوالہ صدق جدید لکھنو ۱۶ مارچ ۱۹۸۴ء)

اقبال کا بیان کردہ یہ نکتہ لگ بھگ ۳۵ء کا ہے، جو موجودہ حالات کی بہتر عکاسی کرتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کتاب ''داستان عمل'' مصنف منشی عبدالرحمٰن کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''قوموں کی تعمیر ان کے افراد کے کردار اور سیرت کی تعمیر سے ہوتی ہے، یہی وہ نکتہ ہے جس کی بناپر انگریزی عہد سے پہلے ہماری زبان اور تعلیم کا بڑا سرمایہ اخلاقی کتابوں کا نصاب تھا۔ کریما سے گلستان تک جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، وہ سرتاسر اخلاقی تھا۔ اور اس سے جو سبق ملتا تھا، وہ ہر عمر میں پڑھنے والے کے کام آتا تھا۔ انگریز آئے، تو بچوں کے لئے کتے اور بلیوں کے قصے اپنے ساتھ لائے جن سے طفلانہ دلچسپی کے سوا کوئی اخلاقی تعمیر۔ سیرت کا فائدہ۔ اور نہ زندگی کا کوئی قاعدہ معلوم ہوا۔ ہماری کتابوں میں جو کچھ تھا۔ وہ سرتاپا بزرگوں کی حکایات۔ دانایان روزگار کے حکیمانہ مقولے اور قرآن پاک اور احادیث کے احکام وارشادات تھے۔ جو عمر بھر کے ہر موقعہ کے لئے کافی تھے۔

اب جب سیاسی حالات بدل چکے ہیں۔ تو ضرورت ہے کہ ہمارے تعلیمی نصاب میں بھی اصلاح ہو۔ اور پھر سے اخلاقی تعلیمات کو ہمارے نصاب میں مناسب جگہ دی جائے۔ اس وقت پاکستان کے عملہ سرکاری ملازمین۔ تجار اور عام افراد میں جو اخلاقی نقائص نظر آرہے ہیں۔ اور جن کا ہر روز اخباروں میں اظہار ہوتا رہتا ہے۔ وہ سب کا سب اسی تعلیمی نقص کا نتیجہ ہے۔

ہماری پچھلی تاریخ صرف قتل وخون اور فوج کشی کی داستان نہیں ہے، بلکہ بزرگوں، بادشاہوں، اکابر، امراء، وزراء، اہل سیاست اور اہل علم کے اخلاقی کارناموں سے لبریز ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے اہل قلم اور مصنفین ان جواہر ریزوں کو یکجا کر کے قوم کے سامنے پیش کریں۔ اور شعبہ تعلیم ان کو اپنے نصاب میں جگہ دے۔ تاکہ نوجوانوں کے اخلاق پاک وصاف اور بلند ہوں۔ ورنہ یاد رہے کہ اخلاقی بلندی کے بغیر نہ کوئی قوم زندہ رہی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین لکھتے ہیں۔

'' اگر ہم نے اپنے ملک کے لئے ایک اسلامی نظام تعلیم کی تعمیر میں دیر کی تو ہم اعتقادی اور اخلاقی لحاظ سے دن بدن کمزور ہوتے چلے جائیں گے، کسی قوم کی اعتقادی یا اخلاقی قوت یعنی نصب العین کی محبت اس کی تمام قوتوں کا سرچشمہ ہوتی ہے، اس پر قوم کی وحدت اور تنظیم کا دارومدار ہوتا ہے اور اسی کی بنیادوں پر قوم کی فوجی اور اقتصادی قوت تعمیر پاتی ہیں، اگر نصب العین کی محبت کمزور ہو جائے تو قوم کی ساری قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔

ہم چاہیں یا نہ چاہیں لیکن ہم دوسری قوموں کے ساتھ ایک ایسی دوڑ میں شریک ہیں، جس میں ہر قوم نے جان کی بازی لگا رکھی ہے، جو قوم اس دوڑ میں ہار جائے اس کی سزا یہ ہے کہ اسے مٹا دیا جاتا ہے اور جو جیت جائے اس کا انعام یہ ہے کہ دوسری قومیں اس کی غلام بنا دی جاتی ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم اس دوڑ میں جیت رہے ہیں یا ہار رہے ہیں، ہر دوڑ کی طرح اس دوڑ میں بھی وقت کا پہلو نہایت اہم ہے، جو قوم وقت ضائع کرے گی، خواہ وہ کیسی ہی طاقتور ہو ضرور ہار جائیگی۔ اگر ہم نے وقت ضائع کیا تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ دوسروں کے تصورات اور معتقدات کا سیلاب ہمیں گھیرتا چلا جائیگا اور اگر ہم نے عجلت سے کام لیا تو ہم نہ صرف اس سیلاب سے محفوظ رہینگے، بلکہ ہمارے اعتقادات وتصورات کا سیلاب دوسروں کو اپنے گھیرے میں لے لیگا۔ افسوس ہے کہ ہم نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح نہیں سمجھا کہ تعلیم کا معاملہ محض تعلیمی نوعیت کا نہیں، بلکہ سیاسی نوعیت کا ہے اور ہماری زندگی اور موت اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ (اسلام کا نظریہ تعلیم صفحہ ۳۸۔۳۹)

''کسی قوم کی تاریخ میں زندگی اور موت کو پیدا کرنے والے عوامل کے اثرات چند سالوں، بلکہ بعض اوقات چند صدیوں میں بھی نمودار نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود یقینی طور پر نمودار ہوتے ہیں اور ان کا اثر روکا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی قوم زندہ ہو رہی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ دنیا اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ آج کرے یا چند صدیوں کے بعد۔ دنیا

ضرور اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ کرے گی۔ اسی طرح سے اگر کوئی قوم مر رہی ہے تو یہ معمولی بات ہے کہ لوگ اس کی موت کا نظارہ آج دیکھیں یا کچھ عرصہ کے بعد، اس کی موت لامحالہ دنیا کے سامنے آجائیگی۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم مر رہے ہیں یا زندہ ہو رہے ہیں۔ دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا ہم اپنے اعتقادات کی حفاظت نہ کرنے سے ذہنی طور پر دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور پھر ہماری سیاسی آزادی بھی خطرہ میں پڑ جائے گی اور یا پھر ہم اپنے معتقدات سے دوسروں کو ذہنی طور پر مغلوب کر کے ان کی سیاست پر غالب آجائیں گے، موت اور زندگی، غلامی اور آزادی کی راہوں کے درمیان دنیا کی کسی قوم کے لئے کوئی مقام نہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہمارا رخ کس طرف ہے۔ ذہنی آزادی کی طرف یا ذہنی غلامی کی طرف۔ زندگی کی طرف یا موت کی طرف؟ اب بھی ہم اپنے نظام تعلیم کو بدل کر اپنے نظریۂ زندگی کے مطابق نہیں بنا سکے تو ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نہایت ہی دلخراش اور اندوہناک ہے۔''

''کسی قوم کا امتیازی نشان جو اسے دوسری قوموں سے الگ ایک قوم بناتا ہے اور اس کی ہستی کا ثبوت ہوتا ہے، اس کا اعتقاد یا اس کا تصور حیات ہی ہوتا ہے۔ غلامی اصل میں ذہنی غلامی ہے اور آزادی ذہنی آزادی۔ جو قوم سیاسی غلامی کے باوجود اپنے نظریۂ زندگی پر قائم رہ سکتی ہے اور اسے فی الواقع اپنے فکر و عمل کا مدار محور بنا سکتی ہے، وہ درحقیقت آزاد ہے، اس کے برعکس سیاسی آزادی کے ہوتے ہوئے جس قوم کے فکر و عمل کی بنیاد غیروں کے معتقدات پر ہو، وہ آزادی کے باوجود غلام ہے سیاسی آزادی کسی قوم کے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر قوم سیاسی آزادی کو اپنی ذہنی آزادی کی خاطر حاصل کرتی ہے۔

اسی طرح سے ہر قوم کی شکست ذہنی شکست ہے اور فتح ذہنی فتح ہے، کوئی قوم فوجی شکست سے اس وقت تک پریشان نہیں ہوتی، جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی شکست ہو گا اور کوئی قوم فوجی فتح سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی، جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی فتح ہو گا۔ لیکن قوموں کی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے فوجی شکست ہمیشہ ذہنی شکست پر اور فوجی فتح ہمیشہ ذہنی فتح پر ختم ہوتی ہے۔

'' اسلامی تعلیم کے معنی یہ نہیں کہ ہم اسلامیات کے ایک مضمون کو آٹھویں جماعت تک نصاب تعلیم میں شامل کر دیں۔ اگر ہم اسلامیات کے علیحدہ مضمون کو ایم اے اور ایم ایس سی کی آخری جماعت تک بھی شامل کریں تو اس سے ہمارا نظام تعلیم اسلامی نہیں بن سکتا۔ اسلامی نظام تعلیم وہی ہو سکتا ہے، جس میں تمام علوم کی نصابی کتابیں اسلام کے نظریہ انسان و کائنات کے مطابق ہوں۔ چونکہ اسلام کے نظریۂ انسان و کائنات کی روح خدا کا تصور ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نظام تعلیم اسلامی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس میں تمام سائنسی علوم کی نصابی کتابیں اس طرح نہ لکھی گئی ہوں کہ خدا کا عقیدہ کرنے والا مرکزی اور محوری تصور ہو۔

مغرب میں جو مختلف علوم کی کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ اسلامی نظریہ کائنات کے مطابق نہیں، کیونکہ ان کتابوں کا بنیادی اعتقاد یہ ہے کہ صداقت وہی ہے، جسے ہم حواس خمسہ سے دریافت کر سکتے ہیں۔ چونکہ یہ اعتقاد درست نہیں، اس لیے جو علوم اس اعتقاد کی روشنی میں مرتب کیے گئے ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی پہلو سے ناتمام اور ناقص رہ گئے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی نظریہ کائنات کے مطابق سب سے بڑی صداقت جو تمام صداقتوں کی ابتدا اور انتہا ہے خدا ہے۔ اگرچہ ہم خدا کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے، تاہم مظاہر قدرت کے اندر جو نظم اور مقصد کے اوصاف پائے جاتے ہیں، وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم خدا کے تصور کو ایک ایسے معقول علمی تصور کے طور پر قبول کریں، جو تمام علوم کی جان ہو۔ علوم کے متعلق مغربی تہذیب اور اسلام کے نقطۂ نظر کے اس بنیادی فرق کی وجہ سے اسلام مغرب کے ہر علمی موقف کو من و عن تسلیم نہیں کرتا، بلکہ ہر علمی مسئلہ کے متعلق اپنے بنیادی تصورات کی روشنی میں اپنی جداگانہ رائے قائم کرتا ہے اور اپنا الگ فیصلہ صادر کرتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق اسلام کے نزدیک حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، درست کیا ہے ور غلط کیا ہے۔ معقول کیا ہے اور نامعقول کیا ہے؟ قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ وہ حکمت کی کتاب ہے اور اس ذات پاک نے نازل کی ہے، جو آسمان اور زمین کے اسرار و رموز کو جانتا ہے **قل**

انزلہ الذی یعلم السر فی السموات والارض۔ (اے پیغمبر کہیے کہ اسے اس ذات پاک نے نازل کیا ہے جو کائنات کے اسرار و رموز جانتا ہے) پھر قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ وہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کر دے۔ **الحق الحق و یبطل الباطل** (تاکہ وہ حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دے دے) اور وہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ علمی مسائل سمیت ان تمام مسائل کے بارہ میں اپنے فیصلے صادر کرے جن میں لوگ اختلافات رکھتے ہیں (**لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ**۔ تاکہ ان مسائل میں لوگوں کے درمیان فیصلے صادر کرے جن میں وہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں)۔

چنانچہ قرآن حکیم انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ہمیں ایسے تصورات عطا کرتا ہے، جس کی روشنی میں ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ قرآن حکیم کے نزدیک علم، عقل، حکمت، سائنس، طبعیات، حیاتیات، نفسیات، سیاست، فن، اخلاق، تعلیم، اقتصاد، قانون، تاریخ، ارتقا، نبوت، انسان، جبلت، نصب العین ایسے موضوعات کے متعلق صحیح نقطۂ نظر کیا ہے۔ ان سب موضوعات کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر خدا کے عقیدہ پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام تعلیم میں خدا کا تصور تمام علوم کا محوری تصور ہو۔ اسلامی نظام تعلیم میں بے خدا طبعیات، بے خدا حیاتیات، بے خدا نفسیات، بے خدا سیاست، بے خدا قانون، بے خدا اقتصادیات، بے خدا تاریخ، بے خدا فلسفے، علمی نظریت کی حیثیت سے پڑھائے نہیں جا سکتے۔ بلکہ صرف ان کی منطقی اور عقلی غلطیوں کو سمجھانے کے لئے پڑھائے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان علوم اور نظریات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کس طرح سے جب کوئی علم نظریہ خدا کے تصور سے الگ ہو کر وجود میں آئے تو اس میں عقلی اور منطقی خامیاں اور ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسلامی نظام تعلیم ایسے نظریات کی خامیوں اور ناکامیوں کو دریافت کر کے آشکار کرتا ہے۔ (اسلامی تعلیم مئی، جون ۱۹۷۲ء)

بڑا بننے اور فساد پھیلانے کی سزا

قرآن میں ایک جگہ ہے۔

تلک الدار الاخرہ نجعلھا للذین لایریدون عدوا فی الارض ولا فسادا۔

(آخرت کا یہ گھر ہم نے ان لوگوں کے لئے تیار کیا ہے جو دنیا میں نہ تو بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ ہی فساد برپا کرنا چاہتے ہیں)۔

اس آیت میں بڑے پن سے دستبرداری اور فساد برپا نہ کرنے پر خوشخبری سنائی گئی ہے، خوشخبری بھی معمولی نہیں، بہت بڑی، یعنی آخرت میں جنت کی صورت میں خوشخبری اور اللہ سے آخرت میں ملاقات کی صورت میں، ایک حدیث شریف میں تکبر (بڑے پن) کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جس میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں نہیں جائے گا، فساد کے بارے میں قرآن میں ماضی کے بعض سرکش لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے **فاکثر فیھا الفساد فصب علیھم ربک سوط عذاب** (پس ان میں اکثر نے زمین پر فساد برپا کیا پس ان پر اپنے رب کے عذاب کا کوڑہ برسا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے پن کی نفسیات اور فساد پھیلانا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت میں محرومی کی صورت میں ملی گی۔

اپنے آپ کو بڑی شخصیت سمجھنا، دوسروں کو حقیر سمجھنا، اور دوسروں پر برتری چاہنا، یہ ایسی بیماری ہے جو کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے، جس سے دوسروں سے تعلقات کشیدہ رہتے ہیں، اللہ کی زمین میں فساد پھیلانا یہ بھی سنگین جرم ہے، فساد کی ایک نوعیت تو یہ ہے کہ بااختیار یا صاحبان اقتدار، اقتدار کے نشہ میں دوسروں پر ظلم و زیادتیاں کرتے رہیں، اور ان کو ہر صورت میں اپنا زیر دست بنائیں یہ روش ہمیشہ صاحبان اقتدار کی رہی ہے اور آج بھی ہے، فرق یہ ہے کہ آج یہ فساد پھیلانے کی روش زیادہ شدت سے جاری ہے، اللہ کی زمین پر فساد پھیلانا اور اللہ کے بندوں پر اپنا حکم چلانا، یہ روش ظاہر کرتی ہے کہ فرد اللہ کی زمین کو اللہ کی زمین نہیں، بلکہ اپنی زمین سمجھتا ہے اور اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ سمجھتا ہے۔

فساد پھیلانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ اختیار اور اقتدار تو زیادہ نہیں ہے، لیکن کسی ادارہ، کسی انجمن، کسی گروہ میں کوئی حیثیت حاصل ہے، یا اگر حیثیت نہ بھی ہو تو اپنے اکڑ فونی مزاج کی وجہ سے دوسروں سے الجھنا اور ان کو پریشان کرنا اور ان سے دست و گریباں ہونا، یہ بھی فساد ہی کے زمرے میں شامل ہوتا ہے، لیکن یہ فساد کی ہلکی صورت ہے۔

تکبر اور فساد پھیلانا، یہ چیز بتائی ہے کہ فرد خدائی صفات میں شامل ہونے کا مریض ہے، ایسے فرد کی سزا جہنم ہی ہے۔

اس دور میں یہ دونوں بیماریاں کچھ زیادہ ہی ہیں، جس کی وجہ سے اللہ کی زمین میں فساد برپا ہو گیا ہے اور لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے، بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں گناہ جتنے بڑے گناہ ہیں، اسی قدر ان گناہوں کا شعور وادراک بھی سلب ہو گیا ہے۔

یہ باطنی نوعیت کے گناہ ہیں، جو باطن سے ابھر کر فرد کو بڑے پن اور فساد کی نفسیات میں مبتلا کرتے ہیں، ان باطنی گناہوں سے بچنے کے لئے محض شعور وادراک بھی کافی نہیں ہے، بلکہ باطن کی اصلاح پر زور دے کر باطن کی تہذیب کے عمل کو جاری رکھنا ہے۔

کوں سا فرد ہے، جو چاہے گا کہ وہ جہنم میں جائے، جہنم سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ دنیا میں بڑا بننے سے بچا جائے اور اللہ کی زمین میں فتنہ وفساد برپا کرنے سے ڈرا جائے۔

ان بیماریوں سے بچنا جہنم سے بچنا ہے، اس کے لئے نفس کو جتنے بھی مجاہدوں کے مراحل سے گزارا جائے کم ہے۔

تکبر اور ظلم وفساد کا وقت تو مختصر ہوتا ہے، لیکن اس کی سزا بڑی سخت ہوتی ہے اور طویل عرصہ تک جہنم کی صورت میں بھگتنی پڑتی ہے۔

ایسے افراد کو دنیا میں بھی سزا ملتی ہے، وہ سزا یہ ہے کہ ان کے سکوں کے نظام کو درہم برہم کر دیا جاتا ہے، وہ تاریکی اور ظلمات کی حالت میں رہتے ہیں۔

ہوش سے کام لینے اور سنبھلنے کی ضرورت ہے۔

دنیاداری سے دنیاپرستی تک

دنیاداری یعنی دنیا میں زیادہ الجھنا اگرچہ صحیح نہیں ہے، لیکن اگر دنیاداری کے ساتھ نماز، زکوٰۃ، صدقہ اور ذکر وغیرہ کی پابندی موجود ہے تو اس طرح کی دنیاداری دینداری کا ذریعہ بنے گی اور اسے اللہ کی مسلسل یاددہانی کراتی رہے گی، لیکن اگر دنیاداری کے ساتھ دینی فرائض اور ذکر وغیرہ موجود نہیں ہے تو اس طرح کی دنیاداری کا نتیجہ دنیاپرستی کی صورت میں ہی ظاہر ہو سکتا ہے، اس طرح دنیاداری رفتہ رفتہ فرد کو اللہ سے دور کر کے مادیت پرستی کی راہ پر گامزن کرے گی۔

اس وقت مادہ پرستی پر مبنی پوری تہذیب عروج پر ہے، اس سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ دنیاوی الجھنیں کم سے کم ہوں اور اللہ سے تعلق مستحکم ہو، اس کے بعد بھی اللہ سے مسلسل مانگتے رہنے کی ضرورت ہے کہ وہ دنیاپرستی کے اثرات سے بچالے اور اس کے دین وایمان کی حفاظت فرمائے۔

دنیاپرستی اور بت پرستی میں مشابہت موجود ہے، بت پرستی میں بتوں کو سجدہ کرنا پڑتا ہے جب کہ دنیاپرستی میں دل مکمل طور پر دنیا کو دینا پڑتا ہے، اور جسم وجان اور ذہن کی ساری صلاحیتیں دنیا میں صرف کر کے دنیا کو مقصود ومعبود بنایا جاتا ہے، قرآن نے خواہشات کو الٰہ (معبود) قرار دیا ہے، نفس پرستی ہو، یا بت پرستی، یا دنیاپرستی، یہ سب الٰہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، جو نہ صرف عبدیت کے منافی ہے بلکہ سرکشی ہے۔

دنیاپرستی کی خاصیتِ بد یہ ہے کہ وہ خوبصورتی کے ساتھ آتی ہے، جس سے دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ خدا پرستی کے مقابل نہیں ہے، اس لئے دنیاداری کو اختیار کرتے ہوئے انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے کہ فرائض، عبادت اور ذکر وغیرہ کسی صورت میں نہ چھوٹنے پائے، دوسری صورت میں دنیاداری سے دنیاپرستی کا سفر زیادہ دور نہیں ہے۔

قرآن میں سورت ابراہیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دعا یہ آتی ہے '' یااللہ ان بتوں نے بہت ساری مخلوق کو گمراہ کیا ہے، مجھے اور میری اولاد کو ان بتوں کی پرستش سے بچایئے۔(آیت نمبر ۳۵۔۳۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی کی یہ دعا ہمیں بتاتی ہے کہ اپنے دور کے طاقتور فتنوں سے ڈرتے رہنا ہے اور اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دینا چاہئے، اُس دور کا سب سے بڑا فتنہ بت پرستی کا فتنہ تھا، لیکن موجودہ دور کا سب سے بڑا فتنہ (جو بت پرستی ہی کی طرح سنگین فتنہ ہے، جس کی اس وقت دنیا بھر میں پرستش کی جارہی ہے) وہ مادیت پرستی کا فتنہ ہے، جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، مادیت پرستی کا مطلب یہ ہے کہ خدا فراموشی کی قیمت پر زیادہ سے زیادہ دنیا آجائے، دنیاوی زندگی خوشحال سے خوشحال تر ہوجائے، آسائش کا سارا سامان موجود ہو، بڑی گاڑی، بنگلہ اور بینک بیلنس ہو، اس طرح لذت کی زندگی حاصل ہوجائے، اور مادہ پرستی کی فکر اور کاوشوں کے علاوہ دوسری کوئی فکر نہ ہو۔

یہ اس دور کا سب سے طاقتور فتنہ ہے، میڈیا کے جدید طاقتور آلات کے ذریعہ پوری طرح اس کی روح پھونکی جارہی ہے۔

دنیا تو کسی حد تک ہر انسان کی ناگزیر ضرورت ہے، لیکن زیادہ سے زیادہ دنیا کی فکرمندی مقصود بن جائے، خدا، دین ومذہب اور آخرت سب ذیلی چیزیں بن جائیں، یہ اس دور کا عالمگیر فتنہ ہے، عالمگیریت کے موجودہ دور میں اس فتنہ اور اس کے اثرات سے بچنا سب سے زیادہ مشکل ترین کام ہے۔

مسلم دنیا خود اس عالمگیر فتنہ کے زیر اثر ہے اور دنیا نے اس کے دل اور ذہن کو جکڑ لیا ہے، جب دنیا مقصود ہوجائے تو اس صورت میں باقی بچتا ہی کیا ہے، اس لئے ہمیں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تتبع میں اللہ سے روزانہ یہی دعا مانگنی چاہئے کہ یااللہ دنیا پرستی کے فتنہ نے بہت ساری مخلوق کو گمراہ کیا ہے، ہمیں اس طاقتور فتنہ اور اس کے اثرات بد سے محفوظ فرما اور ہماری حفاظت فرما۔

دنیا کی چاہت کی تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دنیا ساری سرگرمیوں کا مرکز بن جائے اور مقصود کی حیثیت اختیار کرجائے، دنیا کی چاہت کی دوسری صورت یہ ہے کہ دنیا مقصود تو نہ ہو لیکن دنیا کی ہوس موجود ہو، اور ہر وقت یہ لالچ اور فکر ہو کہ دنیا حاصل ہوجائے۔

دنیا کی چاہت کی یہ دونوں صورتیں فتنہ ہیں، پہلی صورت سنگین فتنہ ہے، جب کہ دوسری صورت کچھ کم تر فتنہ ہے۔

دنیا کی چاہت کی تیسری صورت یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق دنیا حاصل ہوجائے اور اس کے لئے کوشش ہو، یہ تیسری شکل نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن بات ہے۔

قرآن میں سورت النور میں ایسے لوگوں کی تعریف کی گئی ہے ''(یہ) لوگ جن کو تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر اور نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے سے غافل نہیں کرتی۔''

آگے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے ''تاکہ اللہ ان کے عملوں کا بہت اچھا بدلہ دے اور اپنے فضل سے زیادہ بھی عطا کرے۔(آیت نمبر ۳۷۔۳۸)

مسلمان، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے کی وجہ سے مادہ پرست تہذیب کا حصہ تو نہیں بنتے، ان کا ایمان قائم رہتا ہے لیکن دنیاداری کی لائین میں مگن اور محویت کی وجہ سے ان پر دنیاداری کا رنگ غالب ہونے لگتا ہے، اور ان کے لئے مادہ پرستی تک پہنچنے کے لئے راستہ ہموار ہوسکتا ہے، اس لئے مادہ پرست تہذیب سے سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔

موجودہ دور میں مالی اعتبار سے مستحکم حالت کا ہونا اچھی حالت ہے، اس سے اہل دنیا سے بے نیازی ہوتی ہے، دوسروں کی محتاجی سے بچاؤ کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ مستحق افراد کی امداد کی بھی۔ اگر بہت زیادہ وقت صرف کئے بغیر مالی حالت بہتر ہوتی ہے تو اسے ایک اعتبار سے انعام ہی شمار کیا جائے گا، بشرطیکہ دنیا کی محبت موجود نہ ہو۔

مادہ پرستانہ تہذیب میں افراد کو پیسہ کمانے اور سرمایہ کار کی پونجی میں اضافہ کرنے کی مشین سمجھا جاتا ہے، مادہ پرستانہ تہذیب میں قوموں کو غلام بنانے اور ان پر اپنی پالیسیاں مسلط کرنے کے لئے سود در سود قرضہ کا جال بچھایا جاتا ہے اور خود اپنی قوم کے افراد کو بھی قرضوں کے جال میں پھنسایا جاتا ہے۔

اچھاانسان بننا

ہم سب کی ضرورت

ایک حدیث شریف ہے کہ تم میں اچھاانسان، وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے اچھاہو، دوسری حدیث ہے تم میں اچھاانسان وہ ہے جو لوگوں کے لئے اچھاہو۔

یہ دونوں احادیث بتاتی ہیں کہ اچھاانسان بننا، یہ اسلام کو مطلوب ہے۔

اچھاانسان بننا اچھے معاشرے کو جنم دینا ہے، یہ کام ایسا ہے جو ہم سب کی اپنی ضرورت بھی ہے تو معاشرے اور ریاست کی بھی۔ اچھاانسان بننا جتنا زیادہ اہم اور ضروری ہے، اسی قدر اس کام سے غفلت موجود ہے، ہماری تعلیم و تربیت کے سارے ادارے معاشرے کو اچھا انسان فراہم کرنے سے قاصر ہیں، سبب یہ ہے کہ اچھاانسان بننے کے لئے اندر کو بدلنا پڑتا ہے، یہی کام ہے جو مشکل ہونے کی وجہ سے کوئی طاقتور ادارہ نہ صرف یہ کہ نہیں کر رہا ہے، بلکہ وہ انسان بننے کے گر اور سلیقہ سے ہی سرے سے آشنا نہیں، جدید تعلیمی ادارے دنیاداری اور مادیت کا جنوں پیدا کرنے اور دنیاوی زندگی کو کامیاب بنانے کے حامل افراد تیار کر رہے ہیں، لیکن وہ اچھاانسان بنانے کے لئے نہ تو تیار ہیں اور نہ ہی ان کے اہداف میں یہ چیز شامل ہے۔

ان حالات میں اگر معاشرے کے ہر طبقہ میں مفادات کی خاطر رسا کشی کی حالت موجود ہے اور ایک دوسرے کو گرانے کی کوششیں جاری ہیں تو یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔

اچھے انسان کی جگہ اگر بُرا انسان سامنے آئے گا، جو تربیت سے محروم ہوگا تو اس طرح کے بہت سارے بُرے انسان مل کر معاشرے کو فساد ہی سے دوچار کریں گے، جس کا منظر اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں، معاشرے کی اس زبوں حالی کی وجہ سے ہر شخص پریشان ہے اور غم زدگی کا شکار بھی۔

اسلام جیسی پاکیزہ تعلیمات کی موجودگی میں ہمارا یہ حشر ہو، یہ بہت بڑے المیہ کی بات ہے، اچھاانسان بننا دراصل نفس پرستی کی قوتوں کو پامال کر کے اغراض، مفادات اور مادیت سے بلند ہونے سے تعلق رکھتا ہے، جب تک نفس مہذب نہیں ہوگا، تب تک فرد اچھاانسان نہیں بن سکتا، فرد اچھاانسان نہیں بنے گا تو اپنی ذات کو بھی روزمرہ زندگی میں اذیتوں اور مشکلات سے دوچار کرے گا تو معاشرہ میں بھی فساد پھیلانے کا ذریعہ بنے گا۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اچھاانسان بننے کی کاوشوں کے بغیر ہم اپنے گھروں، اداروں، جماعتوں اور سیاست وغیرہ کو جھگڑوں کا مرکز بنائے بغیر نہیں رہ سکتے، جہاں جھگڑے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا طور طریقہ اور جھگڑے کی سیاست ہو، وہاں مایوسی کی دلدل سے بچنا ممکن نہ ہوگا۔

اچھاانسان وہ ہوتا ہے جس سے مل کر خوشی ہوتی ہے، جو دوسروں کی تکریم کرتا ہے، جو اپنے اخلاق سے دلوں کو مفتوح کرتا ہے، غصہ کے وقت بھی نرمی و محبت کا مظاہرہ کرتا ہے، دوسروں کی دل آزاری سے بچتا ہے، اور ان کے قصوروں کو معاف کرتا ہے، جو افرادِ معاشرہ کو جوڑنے کا کردار ادا کرتا ہے، جو ایثار کا مظاہرہ کرتا ہے، دوسروں کی مدد کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ اچھا بننے سے دین و دنیا کی ساری سعادتیں وابستہ ہیں، جب کہ بُرا انسان بننے سے دنیا و آخرت میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔

نفس پرست افراد سے بچنے کی تاکید

سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا جارہا ہے کہ ''جو آخرت کو نہیں مانتا اور خواہشات کا پیروکار ہے وہ کہیں تمہیں آخرت سے دور نہ کردے اگر ایسا ہوا تو پھر تم ہلاک ہو جاؤ گے۔''

یہ آیت ایسی ہے جو بالخصوص اس دور کے انسان کے لئے بہت بڑے انتباہ کی حشیت رکھتی ہے، ہم جس دور میں رہ رہے ہیں، وہ باطل، اور خواہشات پر مبنی تہذیب کے غلبہ کا دور ہے، اس دور میں ہر طرف ظلمات کی پرچھائیاں موجود ہیں، ہر وقت اپنے ایمان کو بچانے کے لئے چوکنا رہنا پڑتا ہے، ایسے افراد اور ایسے آلات سے محتاط ہونا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے نفس پرستی کے خیالات کا احاطہ ہونے لگے۔

یہ صحیح ہے کہ زندہ رہنا ہے تو ضروری کام کاج تو ہر صورت میں سرانجام دینے ہیں اور لوگوں سے میل جول بھی ضروری ہے، لیکن ایمان اتنی عزیز ترین نعمت ہے کہ روزمرہ زندگی میں سرگرمیاں سرانجام دیتے ہوئے یہ دیکھنا انتہائی ضروری ہے کہ کہیں کسی سے ملاقات یا سوشل میڈیا دیکھتے وقت قلب میں ظلمات کے اثرات تو پیدا نہیں ہوئے۔

اگر ظلمات کے اثرات پیدا ہوئے تو فوراً توبہ تائب ہو کر بہتر حالت میں آنا چاہئے، ورنہ نفس پرستی پر مبنی مظاہر سے ذہن اتنا مسموم ہو جاتا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار گناہوں کے خیالات کا غلبہ ہونے لگتا ہے، موجودہ دور دجالی تہذیب کے غلبہ کا دور ہے، نفس کی

تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں خیر کے مقابلے میں شر کو قبول کرنے کی صلاحیت غیر معمولی طور پر زیادہ ہے، اس لئے کہ شر کے ہر کام سے نفس کو لذت ہوتی ہے۔

جب فرد نفس پرست افراد سے ملتا ہے یا نفس پرستی پر مبنی مظاہر کو دیکھتا ہے تو اس سے نفس کی قوت میں دگنا اضافہ ہو جاتا ہے اور بُرائی کی راہ اختیار کرنا اس کے لئے زیادہ آسان ہو جاتا ہے، نفس پرستی پر مبنی مظاہر کی طرف رجوع ہونے سے دل اور ذہن دونوں فساد کے زیر اثر آنے لگتے ہیں، قرآن کی مذکورہ آیت میں نفس کے مظاہر سے تباہی کا انتباہ دیا گیا ہے، یہ تباہی آخرت کی دائمی زندگی کی تباہی ہے۔

ہمیں بُرائی کی قوتوں کے خلاف اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے حوالے کرنا چاہئے کہ اس کے فضل خاص کے بغیر چارہ کار نہیں ہے، لیکن اس کا مطلب اپنی کاوشوں سے دستبردار ہونا نہیں ہے، کاوشوں کا مطلب یہ ہے کہ فاسد معاشرے کے اثرات سے ہر ممکن حد تک بچنا چاہئے اور اللہ کے ذکر کا سہارا لینا چاہئے۔

منصب اور لامحدود اختیارات

کے نقصانات

ہر باصلاحیت فرد عام طور پر کوشاں ہوتا ہے کہ اسے منصب ملے، حالانکہ منصب (عہدہ) اپنے ساتھ بھاری ذمہ داریاں لاتا ہے، چونکہ منصب کی وجہ سے فرد کو اختیارات حاصل ہوتے ہیں، اس لئے وہ سخت آزمائش میں آجاتا ہے، وہ ان اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ایک تو وہ بڑا بننے کی کوشش کرتا ہے، دوسرے یہ کہ منصب سے وہ مال بنانے کے لئے بھی کوشاں ہوتا ہے، اس لئے منصب فرد کے لئے خطرہ بن جاتا ہے، ہاں جسے اللہ بچانا چاہے وہی بچ سکتا ہے۔

اگر فرد کو ایسا منصب حاصل ہو جس کے تحت اسے لامحدود اختیارات حاصل ہیں تو ایسا فرد دینی اعتبار سے زیادہ خطرہ سے دوچار ہوتا ہے، یہاں لامحدود اختیارات کے کچھ نقصانات پیش کئے جاتے ہیں۔

• فرد بے قابو ہو جاتا ہے • فرد کا ذہن صحیح سمت میں کام کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے • فرد آپے سے باہر ہو جاتا ہے، • فرد احساس برتری سے مغلوب ہو جاتا ہے۔

• اختلاف رائے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، مخالفین سے انتقام لینے لگتا ہے • وہ ہر مسئلہ کا حل طاقت کو سمجھنے لگتا ہے • وہ اصلاح کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا • وہ اپنے گرد اپنی تعریف کرنے والے افراد کو جمع کر لیتا ہے، جو اسے صحیح مشورہ دینے سے قاصر رہتے ہیں اور اس کے ہر معاملہ میں اس کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔

• وہ دل کی بات سننے سے بے بس ہو جاتا ہے، وہ عقلِ محض اور مادی عقل کو اپنا رہبر بنانے لگتا ہے، جو اسے طاقت ہی کو سب کچھ سمجھنے پر اکسانے لگتا ہے • اس سے لوگوں کی بہت

زیادہ حق تلفیاں ہونے لگتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ آخرت میں ''مسکین'' کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا کہ اس کی نیکیاں حق تلفیاں کرنے والوں کے حصہ میں چلی جائیں گی۔

لامحدود اختیارات کے ان نقصانات کی وجہ سے یہ اختیارات مفت میں بھی مل جائیں تو قبول کرنے سے انکار کیا جائے، اس لئے کہ اس سے بندہ، عبدیت کے دائرے سے نکل جاتا ہے، جو اللہ کی سخت ناراضگی کا باعث ہے۔

زندگی جو آزمائش کی خاطر ملی ہے، اسے اگر نفس کی اکساہٹ پر صرف کیا جائے تو یہ نقصان کا سب سے بڑا سودہ ہے۔

سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جدید آلات۔ دجال

اور بچاؤ کی صورت

خوبصورت موبائل نے عجیب غریب صورتحال پیدا کر دی ہے کہ اس کا کھولنا تو اپنے بس کی بات ہے، لیکن اس کو چھوڑنا یعنی اسے بند کرنا، یہ موبائل کا کام ہے، بالکل وہ صورتحال ہے کہ ایک شخص کو دریا میں کمبل تیرتے ہوئے نظر آیا، وہ دراصل کمبل نہیں، بلکہ شیر تھا، وہ کمبل لینے کے لئے دریا میں وہاں تک پہنچا، کمبل کو پکڑا تو شیر نے اسے قابو کر لیا، اس کے ساتھی نے اس کو آواز دی، جلدی آؤ، اس نے کہا کہ میں تو کمبل کو چھوڑ رہا ہوں، لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑ رہا ہے۔

اس آلے کو کھولنے کے بعد جان چھڑانا، عام طور پر فرد کے بس کی بات نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آلے میں دجال کی سی خصوصیات ہیں۔

اسی طرح مصنوعی ذہانت کے ذریعہ معلومات کا جو سمندر ابلا ہے، اس سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، آپ بیشتر جس موضوع پر بھی ان سے معلومات حاصل کریں، وہ آپ کو اس موضوع کے بیشتر پہلوؤں پر ایسی معلومات دے گا، گویا آپ نے اس موضوع پر بہت ساری کتابوں کا مطالعہ کر لیا ہے، جسمانی نوعیت کے امراض ہوں یا دینی و مذہبی نوعیت کے مسائل یا دنیاوی معاملات، ہر مسئلہ پر آپ کو بلا خیر کے معلومات مل جائے گی، یہ الگ بات ہے کہ اس معلومات میں ان کا اپنا نقطہ نگاہ بھی شامل ہوتا ہے۔

بتانا مقصود یہ ہے کہ دجال کے ظہور سے پہلے یہ حیرت انگیز ایجادات جو فرد و افراد کو مسحور کر دیتی ہیں اور وہ ان میں گم سم ہو جاتا ہے، جب ان آلات میں یہ طاقت موجود ہے تو دجال میں کیا بلا کی طاقت و تاثیر نہ ہو گی۔

دجال کی پیشانی پر کافر لکھا ہوا ہو گا، جسے غیر پڑھا لکھا صاحب ایمان بھی پڑھ لیگا، دجال کو اللہ کی طرف سے یہ طاقت دینا، ہمارے ایمان کے لئے بہت بڑا خطرہ ہو گا۔

اس خطرے سے بچنے کے لئے ہمیں ابھی سے تیاری کرنی چاہئے اور اللہ سے مسلسل اس کے شر سے پناہ بھی مانگتے رہنا چاہئے، تیاری سے مراد یہ ہے کہ اللہ سے تعلق اتنا مستحکم کریں کہ اللہ ہمارے دل و دماغ کو اپنے انوار سے بھر دے، تاکہ ہم ان انوار کی حالت میں رہیں اور دجالی تہذیب کے پیدا کردہ آلات و ایجادات اور خود دجال کی طرف متوجہ نہ ہوں اور اس سلسلے میں ہم اللہ کی پناہ میں آجائیں۔

جس دجال سے اللہ کے رسول ﷺ اور سارے انبیاء اکرام نے پناہ مانگی ہے، اس دجال کا ہمیں یا ہماری نئی نسلوں ہی کو سامنے کرنا پڑے گا۔

مادی تہذیب کے علمبردار دجال کے لئے پوری طرح حالات سازگار بنانے کے لئے شب و روز کوشاں ہیں، یہ دجال پوری دنیا میں اودھم مچائے گا اور ایمان والوں کے لئے بہت بڑا خطرہ ہو گا، اس وقت اللہ کے فضل سے ایسے طاقتور صاحب ایمان افراد بھی موجود ہوں گے جو بے خوف ہو کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

حدیث شریف میں ایک شخص کا ذکر آتا ہے کہ وہ دجال کو رب ماننے سے انکار کرے گا، دجال اسے اسی وقت قتل کرے گا، کچھ دیر کے بعد اسے زندہ کرے گا، وہ مومن شخص دجال سے کہے گا کہ اب تو مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ تم دجال ہی ہو۔

دجال اسے دوبارہ قتل کرنے کی کوشش کرے گا، لیکن وہ اسے قتل نہ کر سکے گا، یعنی اللہ نے اسے بے پناہ اختیار نہیں دیے ہیں، اس کی آزمائش کی خاطر اسے ایک حد تک اختیارات دیئے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام آکر اسے اسرائیل کے سب سے بڑے ایئرپورٹ لد کے مقام پر قتل کرے گا، اس کے بعد دنیا میں امن و امان قائم ہو گا اور دجال اور ساری مادہ پرست قوتوں کو شکست ہو گی، اور انسانیت اسلام کی طرف رجوع ہو گی۔

طاقت کا نشہ

شخصیت میں جبر پیدا کرنے کا ذریعہ

ہر دور کے طاقتور افراد سے یہ نکتہ سمجھنے میں ناکامی ہوئی ہے کہ طاقت ایک نشہ ہے، جس طرح نشہ کی حالت میں فرد اول خول بکتا ہے، اسی طرح طاقت کی صورت میں فرد آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور ایسے اقدامات اٹھاتا ہے اور فیصلے کرنے لگتا ہے، جس سے اس سے متعلق افراد اور قوم وملک کو غیر معمولی نقصان ہوتا ہے اور اس کی اپنی شخصیت بھی مجرم ہونے کے احساس کے زیر تلے دب جاتی ہے، طاقت جس قسم کی بھی ہو، وہ فرد کو بے قابو کر دیتی ہے اور فرد دوسروں کی تحقیر وتذلیل کرنے لگتا ہے، اس لئے طاقتور افراد اگر اپنے لئے اور ملک وقوم کے لئے نافع بننا چاہتے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ عام افراد سے زیادہ متوجہ الی اللہ ہونے کے لئے کوشاں ہوں، اس لئے کہ توجہ الی اللہ سے ہی طاقت کی رعونت قابو میں آنے لگتی ہے، اللہ کا خوف اور اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس ہی فرد کے طاقت کے نشہ کو قابو میں رکھتا ہے، ایمان کی رسمی حالت سے طاقت کی رعونت قابو میں نہیں آتی، اس کے لئے طاقتور ایمان کی ضرورت ہے۔

طاقت آفسری کی ہو، حکمرانی کی ہو، مالداری کی ہو، ہر طرح کی طاقت سے نشے کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

عالمی سطح سے لے کر مقامی سطح تک اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو فرد جتنی زیادہ طاقت کا صاحب ہے، اس کا نشہ اسی حساب سے تیز تر ہو جاتا ہے، وہ اپنے جیسے انسانوں کے لئے زیادہ نقصان رساں ثابت ہوتا ہے۔

غرور صرف اس ہستی کے شایان شان ہے، جو کائنات کی خالق ہستی ہے، اس کے علاوہ سارے انسان اس کے بندے ہیں، انہیں وقتی طاقت کے باوجود بندے کی حیثیت سے زندگی

گزارنے کا سلیقہ سیکھنا چاہئے، اگر ایسا ہو جائے تو انسانیت امن اور عزت سے زندگی گزارنے کے قابل ہو سکتی ہے۔

یہ طاقت کی رعونت ہی ہے جو انسانیت کے امن کو غارت کر دیتی ہے، اور اپنے جیسے انسانوں کی زندگی زہر کر دیتی ہے، اور چاہتی ہے کہ اپنے جیسے انسان اس کے غلام بن کر زندگی گزاریں۔

جب اللہ کا خوف وخشیت آجاتی ہے تو فرد پر اللہ کی شان عظمت غالب ہونے لگتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنی طاقت کے بے جا استعمال سے باز آنے لگتا ہے اور اللہ کے بندے کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے لگتا ہے، لیکن طاقت کے صاحب فرد کا اللہ کے خوف سے سرشار ہونا آسان کام نہیں ہے، اس کے لئے اللہ کے سامنے عجز کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے اور خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں کہ یا اللہ مجھے طاقت کی رعونت سے محفوظ فرمالے۔

مسلم معاشروں کو جو مسائل درپیش ہیں، ان کا حل دنیادار قسم کی قیادت کے بس کی بات نہیں ہے، یہ روشن ضمیر قیادت ہی ہے جو ملت کو ان بحرانوں سے بچا سکتی ہے۔

اس طرح کی قیادت اچانک پیدا نہیں ہو سکتی، وہ معاشرے سے ہی ابھر کر سامنے آتی ہے، معاشرے میں اگر دینی اور اخلاقی اعتبار سے جان موجود ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے معاشرے کو اس طرح کی قیادت عطا فرمادیتا ہے، لیکن اگر معاشرہ اس طرح کی قیادت کو پسند کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو اس معاشرے کو غلط اور منفی قیادت کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اسے نئے نئے مسائل اور بحرانوں سے دوچار کر دیتی ہے، دوسرے الفاظ میں منفی اور دنیادار قیادت مسلم معاشرے کی اجتماعی خرابیوں کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس کی سزا بھی۔ مسلم معاشرہ اپنے خدا فراموشی پر مشتمل اعمال سے توبہ تائب ہو کر رجوع ہوتا ہے تو اللہ کی طرف سے اسے روشن ضمیر قیادت عطا فرمائی جاتی ہے۔

یہ مسلم معاشرے کی اپنی پسند ہے کہ وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے کس قسم کی قیادت کو پسند کرتی ہے، منفی قیادت اسے دنیا پرستی اور خدا فراموشی کی راہ پر لگاتی ہے، جب کہ روشن ضمیر قیادت اسے اللہ سے قریب کر کے اللہ کی غیر معمولی مدد کی مستحق بناتی ہے۔

روشن ضمیر قیادت خود احتسابی اور اللہ کی محبت کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے، وہ اللہ کے لئے اپنی ہر چیز قربان کر دینے کی خوبیوں سے بہرہ ور ہوتی ہے اور اہل باطل سے مقابلے کے لئے مستعد بھی۔ اس طرح کی قیادت قوم کی ایمانی حالت کو بہتر بنا کر ان کو ایثار اور قربانیوں کے لئے بھی تیار کرتی ہے، اس قیادت کے صدقے ملت کی ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔

غلط قیادت عتاب کی صورت ہوتی ہے تو صحیح قیادت انعام کی صورت، غلط قیادت کے عتاب کی نوعیت اتنی سخت ہوتی ہے کہ ملت پس کردہ جاتی ہے اور اس قیادت سے جان خلاصی کی صورت پیدا ہی نہیں ہو پاتی۔

جب تک قوم رو دھو کر خدا سے اپنے منفی اعمال کی معافی نہیں مانگتی اور رجوع نہیں کرتی، تب تک یہ عتاب نہیں ٹلتا۔

چونکہ غلط قیادت کے ہاتھ میں ریاست کے سارے وسائل موجود ہوتے ہیں، اس لئے وہ ان وسائل کو اختیار کر کے بھی قوم کو اپنے ہاتھ سے نہیں نکلنے دیتی، لیکن اگر ملت کا ایک حصہ بھی اس قیادت کے اثرات سے نکل کر رجوع کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس رجوع کی برکت سے بھی اللہ تعالیٰ قوم کو صحیح قیادت عطا فرماتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ قوم کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے لئے کون سی راہ اختیار کرتی ہے، رجوع الی اللہ کی صورت یہی ہے کہ صالح افراد کی صحبت کو مضبوطی سے اختیار کیا جائے، تاکہ مزاج میں نیکی کے اثرات راسخ ہو سکیں، معاشرہ جس قدر نیکی کی راہ اختیار کرتا جائے گا، اسی قدر صالح قیادت کے آثار ظاہر ہوتے جائیں گے۔

ہم نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کسی اور جگہ بھی بحث کی ہے، وہ بحث یہاں پیش کرتے ہیں۔

''عالم اسلام کو ایک بڑا چیلنج جو درپیش ہے، وہ روشن ضمیر قیادت کے فقدان کا ہے، ہمیں ایسی قیادت کی ضرورت ہے، جو اہل باطل سے مرعوب نہ ہو، جو جرأت مند ہو اور مادی تہذیب کے علمبرداروں کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کا جھنڈا تھامے ہوئے ہو، اور مسلمانوں کے لئے درد دل کی حامل ہو، ایسی روشن ضمیر قیادت نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ممالک وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود پامال ہیں اور حالت زار کا شکار ہیں اور ہر جگہ مار کھا رہے ہیں۔

اس طرح کی قیادت اللہ کا بہت بڑا انعام ہوتی ہے، کہ وہ ملت کے احیا کا ذریعہ بنتی ہے، اور ان کو درپیش سارے چیلیجز سے عہدہ برآ ہونے کا ذریعہ بھی۔

۵۷ مسلمان ممالک کے حکمرانوں میں سے کوئی بھی قیادت ملت کی یہ ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہے، سبب یہ ہے کہ دنیا سے محبت، مفادات اور موت سے خوف زدگی نے ان کی قائدانہ صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔

ہمیں اللہ سے سب سے زیادہ جو دعا کرنی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ہمیں اس طرح کی قیادت عطا فرمائے، تاکہ ہم دنیا میں از سر نو اسلامی حوالے سے کردار ادا کر سکیں اور باطل سے مرعوبیت کی عمومی فضا کے خاتمے کے صورت پیدا ہو سکے۔

اہل باطل کو عالمی سطح پر قیادت حاصل ہے، ساتھ ساتھ طاقت بھی، اس کی وجہ سے وہ ہمارے مقتدر طبقات کو مرعوب اور خوف زدہ کرنے میں کامیاب ہے۔

روش ضمیر قیادت کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ قوموں کو اٹھانے، ابھارنے اور ان کو بحرانوں سے نکالنے اور صحیح راہ پر گامزن کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، قدرت کی طرف سے انہیں حکمت، فراست اور بصیرت کا وافر حصہ نصیب ہوتا ہے، اس طرح کی قیادت سے

محرومی کا نتیجہ وہی ہوتا ہے، جو اس وقت ہمارا ہے کہ ہم مادی تہذیب کے علمبرداروں کے سامنے بھیگی بلی بنے ہوئے ہیں، جیسا اوپر عرض کیا گیا کہ روشن ضمیر قیادت قوموں پر اللہ کا انعام ہوتی ہیں، ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو عملی طور پر اس طرح کی قیادت کا اہل بنائیں، ساتھ ساتھ اللہ سے مانگتے بھی رہیں۔

روشن ضمیر قیادت جو اللہ کے نور سے دیکھتی ہیں **(فانه ینظر بنور اللّٰه)** وہ اسلامی شریعت پر مکمل عامل ہوتی ہے، اس طرح کی قیادت عالم اسلام ہی کی نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی ضرورت ہے، اس لئے کہ آج کل انسانیت عام طور پر ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کے جنون میں مبتلا ہے، قوموں اور ملکوں کی سطح پر برپا ہونے والا سارا فساد اسی کا نتیجہ ہے، روشن ضمیر قیادت عالم اسلام میں ایسا ماحول پیدا کرے گی، جس سے ایمان کی شعائیں ابھریں گی، کردار کی خوشبو پیدا ہو گی اور سلیقہ انسانیت سے بہرہ وری ہو گی، اور انسانیت کے درمیان پیدا ہونے والی دوری دور ہو گی، اس ماحول سے انسانیت متاثر ہو کر اسلام سے نہ صرف آشنا ہو گی بلکہ اس سے قریب سے قریب تر ہو گی۔

فنی مہارت میں برتری وقت کی اہم ضرورت

موجودہ دور فنی ترقی اور نئی نئی چیزوں کی ایجاد میں مقابلے کا دور ہے، عالمی سطح پر مختلف طاقتیں اپنی حیثیت کو قائم رکھنے اور دوسروں کی عسکری برتری کو روکنے یا دوسروں کو اپنا زیر نگیں بنانے کے لئے شب و روز تلاش و تحقیق میں مصروف ہیں، اس طرح کا اسلحہ تیار ہو رہا ہے کہ جنگوں میں افواج کو براہ راست ایک دوسرے سے مقابلے کرنے کے بجائے ایٹمی ہتھیاروں سے انہیں شکست دی جائے۔

جاسوسی آلات، دوسروں کے رازوں کو جاننے اور انسانوں کے ذہن کو کنٹرول کرنے کے لئے بھی نئے نئے طاقتور اور تیز رفتار آلات وجود میں آرہے ہیں اور اس سلسلے میں امریکہ، چین اور روس کے ماہرین سائنس و ماہرین فن مسلسل کام کر رہے ہیں، تلاش و تحقیق اور جدید ٹیکنالوجی کے معاملے میں جب ہم مسلم دنیا کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس معاملے میں بے حسی اور افلاس فکر کا شکار ہیں اور وہ لگ بھگ ہر معاملے میں عالمی قوتوں کے محتاج ہیں اور عالمی قوتیں ہیں کہ جو ان سے بھاری رقوم لے کر انہیں دوسرے نمبر کی ٹیکنالوجی فروخت کر رہے ہیں۔

مسلم دنیا کے پاس وسائل اور ماہرین اور اہل فن بھی موجود ہیں، لیکن وہ ان وسائل کو اپنے دفاع کے نئے نئے آلات تیار کرنے کے لئے تیار نہیں، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ عالمی دباؤ کے زیر اثر ہیں کہ وہ طاقتیں نہیں چاہتی کہ مسلم دنیا عسکری قوت، اسلحہ جات اور جدید ٹیکنالوجی کے معاملات میں خود کفیل ہوں اور ان کی تلاش و تحقیق کا معیار ہماری تحقیق سے ہمہ آہنگ ہو اور ایسا ہونے سے مسلم دنیا پر ہماری برتری باقی نہ رہ سکے گی۔

تلاش و تحقیق کے اس دور میں مسلم دنیا کی یہ بے حسی اور کسی حد تک بے بسی نہ صرف المناک ہے بلکہ عالمی قوتوں کو ان کو لقمۂ تر بنانے کا ذریعہ بھی۔

ہمارے ملک میں بجلی اور گیس کا بحران ہے، کئی ماہرین نے پانی اور ہوا اور دوسرے طریقوں سے بجلی اور گیس تیار کرنے کی صلاحیت حاصل کرلی ہے اور وہ چھوٹے پیمانے پر بجلی اور گیس تیار کرکے اسے استعمال کررہے ہیں۔

لیکن حکومت کی طرف سے سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے اس سستی بجلی اور گیس کا قومی سطح پر اہتمام نہیں ہورہا ہے۔

موجودہ دور میں قوموں کی سطح پر زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ بے حسی کی حالت کو ختم کیا جائے اور اپنے ماہرین فن کی سرپرستی کرکے ان کے ذریعے تلاش و تحقیق کے کام کو جاری رکھکر ہر معاملے میں خود کفیل ہوا جائے، اس سے وسائل کی بچت بھی ہوگی، اشیائے ضرورت سستی بھی ہوں گی تو ساتھ ساتھ عالمی قوتوں کی محتاجی سے بچاؤ کی صورت بھی پیدا ہوگی۔

ہمارے اقتدار کے جو صاحبان اس معاملے میں بھرپور کردار ادا کریں گے، وہ ملت کی بقا کا ذریعہ بنیں گے اور تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

مسلم دنیا کو اپنے ملکوں میں علم، مہارت، فنون اور ٹیکنالوجیکل ماحول کو فروغ دینا ہوگا، اور اس کے لئے تعلیمی اداروں کو فعال بناکر تلاش و تحقیق کی فضا پیدا کرنی ہوگی۔

قرآن میں بھی اس پر زور ہے **واعدو لھم ماستطعتم من قوۃ** اور جتنی استطاعت ہے ان کے لئے تیار رکھو قوت اور طاقت، آگے ہے تاکہ تم اپنی جنگی تیاریوں سے اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ کردو)۔

مقتدر طبقات میں مال بنانے کی روش کا ہونا

ہمارا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم حکومتی نظام اور انتظامی مشینری کی خرابیوں سے کس طرح بچیں، حکومتی نظام کی تشکیل کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ مال بنانا اور قانون کی زد سے بچ نکلنا، ان کے لئے آسان ہوگیا ہے، یہ آج کی صورتحال نہیں ہے، بلکہ انتظامی مشینری کی شروع سے یہ حالت ہے، البتہ اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔

امریکہ اور یورپ میں ریاستی وسائل کو ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرنا سنگین جرم ہے، پھر ایسے افراد کا قانون کی زد سے بچنا ناممکن ہے، لیکن ہمارا ماجرہ قدرے مختلف ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہمارے زوال کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ حکومت سے وابستہ حلقوں میں مال بنانے کی دوڑ لگی ہوئی ہے، جو عرصے سے جاری ہے، مغربی ملکوں کے اب تک زوال سے بچنے کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کے ہاں قانون کی حکومت ہے اور سرکاری مشینری ناجائز طریقے سے مال بنانے سے محفوظ ہے۔

انتظامی مشینری میں مال بنانے کی روش میں تین اسباب کارفرما ہوتے ہیں، ایک ذہنی تربیت کا فقدان ہوتا ہے کہ ذہن میں اس کے نقصانات کا پہلو غالب نہیں ہوتا، دوسرا سبب قانون کی زد سے بچنے کی صورتیں ہیں کہ ایسے افراد غلط طریقے سے مال بنانے کے باوجود قانون کی زد میں نہیں آتے، تیسرا سبب روحانی اضطراب ہوتا ہے۔

مال بنانے کی روش زیادہ تر روحانی نوعیت کی بیماری ہے، جب روح کی جذباتِ محبت کی تسکین نہیں ہوتی تو شخصیت پر نفس کا دیو غالب آجاتا ہے اور وہ مال کے ذریعے اپنے جذبات کی تسکین چاہتا ہے، مال تو ایسی چیز ہے کہ اس سے نفس کی خواہشات کی تسکین ہو ہی نہیں سکتی۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہماری انتظامی مشینری میں تربیت کے ذریعے یہ احساس پیدا کیا جائے کہ قوموں کی زندہ رہنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ ناجائز مال کے جنون سے محفوظ ہوں اور اپنی قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ نافع ثابت ہوں، دوسری صورت میں مال تو آئے گا، لیکن اس کی جو قیمت ادا کرنی ہوگی وہ یہ ہے کہ ایک تو سکوں، اور خوشی سے محرومی ہوگی دوسرے یہ کہ قوم وملت زبوں حالی سے دوچار ہوگی، تیسرے یہ کہ ملک قرضوں میں جکڑتا جائے گا۔

اعمال سے غفلت کا مزاج

ساری بُرائیوں کا ذریعہ بن سکتا ہے

دین کے کسی بھی حکم سے غفلت کا مظاہرہ ہونا، یہ ایسی بات ہے جو فرد کو رفتہ رفتہ بے عمل بنا دیتی ہے، اگر دین کے بیشتر احکام کے ساتھ یہی معاملہ ہے تو پھر فرد کا سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے، بد قسمتی کی بات ہے کہ اس دور میں دنیا دارانہ ذہنیت کے غلبہ سے دینی احکام کے سلسلے میں اکثر غفلت کا مظاہرہ ہے، نماز سے غفلت، نظر کی حفاظت سے غفلت، زبان کے صحیح استعمال سے غفلت، عورت کی طرف سے پردہ سے غفلت، ملازمت پیشہ خواتین کا اپنے محکمہ کے ساتھی افراد سے تعلقات میں احتیاط سے غفلت، وقت کے صحیح استعمال سے غفلت، غرض کہ غفلت کی زندگی عام ہو گئی ہے، دینی احکام سے یہی غفلت فرد و افراد کو اللہ سے دور کرنے اور انسانی اوصاف کا حامل بننے سے روک دیتی ہے۔

غفلت جب ابتدائی مرحلہ میں ہو تو چونکہ غفلت کا مزاج مستحکم نہیں ہو پاتا، اس لئے اس سے بچاؤ کی صورت آسانی سے پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اعمال سے جب غفلت پختہ ہو جاتی ہے تو پھر وہ مزاج کا حصہ بن جاتی ہے اور عادت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور عادت کو بدلنا محال تر ہوتا ہے، دینی احکام اور اعمال سے غفلت کا مزاج بالآخر ساری بُرائیوں کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس لئے غفلت کو معمولی بیماری نہ سمجھا جائے، ہمت کا مظاہرہ کر کے غفلت سے بچنے کی کوشش کی جائے، ورنہ فرد آخرت میں مسلسل روتا رہے گا، لیکن وہاں روتے رہنا کام نہیں آئے گا۔

اللہ نے قیمتی زندگی آخرت بنانے کے لئے دی ہے، اسے غفلت میں ضایع کرنا سب سے بڑے خسارہ کا سودہ ہے۔

اگر اعمال سے غفلت کا مزاج پختہ بھی ہو جائے تو زندگی کے جس مرحلہ پر بھی بدلنے کا احساس طاقتور ہو جائے تو فرد نیک افراد کی صحبت کے ماحول کے ذریعہ اچھے اعمال کا حامل ہو کر نیکی کا راستہ اختیار کر سکتا ہے، اللہ نے فرد میں غیر معمولی صلاحیتیں رکھی ہیں، وہ جب بھی چاہے بدل سکتا ہے، لیکن اس کے لئے غیر معمولی طلب اور ہمت کی ضرورت درپیش ہے۔

بندہ مومن کی خاصیت

گناہوں سے ڈرتے رہنا

بخاری شریف کی ایک حدیث ہے کہ مومن اپنے گناہوں کو ایسا محسوس کرتا ہے، گویا وہ کسی پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں وہ اس کے اوپر گر نہ جائے، جب کہ فاجر (عادی گناہگار) شخص اپنے گناہوں کو مکھی کی طرح ہلکا سمجھتا ہے کہ وہ اس کے ناک کے پاس سے گزری اور اس نے اپنے ہاتھ سے یوں اس کی طرف اشارہ کیا۔

یہ حدیث شریف گناہوں کے سلسلے میں بندہ مومن کے حالات کی عکاسی کرتی ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے سخت خوف زدہ رہتا ہے، گناہ بڑے ہوں یا چھوٹے، دونوں قسم کے گناہوں کے بارے میں مومن کی حساسیت از حد قابل رحم ہوتی ہے، وہ اپنے گناہوں کو بھولنے ہی نہیں پاتا، بار بار اسے اپنے گناہ یاد آتے ہیں اور وہ استغفار کرتا رہتا ہے، لیکن چونکہ گناہوں کی خاصیت آگ کی سی ہے، اس لئے وہ گناہوں سے اپنے دل میں جلن سی محسوس کرتا ہے، لیکن جب وہ اللہ کی رحمت اور مغفرت کی شان کو دیکھتا ہے تو اسے تسلی ہوتی ہے کہ انشاءاللہ وہ ذات رحیم و کریم اس کے سارے گناہوں کو معاف فرمائے گی۔

بڑے گناہ تو بڑے گناہ ہیں، جس سے مومن کی بے چینی بڑھ جاتی ہے، لیکن چھوٹے گناہوں پر بھی بندہ مومن سخت پشیمان ہوتا ہے اور اس پر خوف زدگی کی حالت طاری رہتی ہے، اپنے ان گناہوں کی وجہ سے مومن محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ آخرت میں سزا سے بچ جائے تو اس پر اللہ کی ذات کا یہ بہت بڑا فضل و کرم ہو گا، اللہ کی سزا ایسی ہے جس کا وہ متحمل نہیں، جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا، اس حدیث شریف میں مومن کے ان احساسات کی نشاندہی فرمائی گئی ہے۔

مومن بڑے گناہوں سے ہل جاتا ہے، لیکن چھوٹے گناہ مثلاً نماز میں کبھی کبھار سستی کا مظاہرہ ہونا، کبھی کبھار غیر ضروری گفتگو کرنا وغیرہ ان گناہوں پر بھی وہ اذیت محسوس کرتا ہے، اور عتاب کا خطرہ بھی۔

مومن کو اللہ نے ایسا دل عطا کیا ہے جو ہر گناہ پر انتباہ بھی دیتا ہے تو ساتھ ساتھ وہ آگ کے انگاروں پر بھی لیٹنے لگتا ہے، جب تک گناہ سے پوری طرح آہ وزاری نہیں کرتا اور توبہ تائب نہیں ہوتا، تب تک اس کے دل کو قرار نہیں ملتا۔

اللہ تعالیٰ ایسا دل ہر ایک کو عطا فرمائے مومن کی حالت یہ ہوتی ہے، لیکن عادی گناہگار کی گناہوں کے سلسلے میں حساسیت باقی نہیں رہتی، اس لئے کہ ایک تو وہ گناہوں کا عادی ہو چکا ہے، دوسرے یہ کہ وہ دل پر محنت کر کے دل کو بنانے کے کام کی طرف سے غافل ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی حساسیت موجود نہیں رہتی۔

بندہ مومن کی گناہوں سے لرزاں وترساں ہونے کی اس حالت کی وجہ سے قرآن میں اس کے لئے بڑی خوش خبریاں سنائی گئی ہیں۔ **ان الحسنٰت یذھبن السیات** (بے شک نیکیاں گناہوں کو مٹاتی ہیں)۔

الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن۔ (جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں ظلم (یعنی شرک) کی ملاوٹ نہیں کی، یہی لوگ ہیں، جن کے لئے امن ہے۔

اس طرح کی اور بھی کئی آیتیں موجود ہیں، جو بندہ مومن کو حوصلہ اور تسلی دلاتی ہیں کہ ان کے گناہوں کو معاف کر دیا جائے گا۔

موجودہ دور میں سیکھتے رہنے اور آگے بڑھتے رہنے کے کام سے غفلت کا مظاہرہ ہونا

زندگی میں سیکھنے کے عمل کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ سیکھ کر آگے بڑھتے رہنا، یہ زندگی کے اہداف میں شامل ہے، سیکھنے کا عمل رکتا نہیں، رکے گا تو جمود پیدا ہو جائے گا، یہ جمود فکر میں بھی ہوگا تو عمل میں بھی، جو بڑے خسارہ کا سودہ ہے، فرد نے جب یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ میں تو سب کچھ سیکھ گیا، اب مجھے مزید سیکھنے کی ضرورت لاحق نہیں ہے تو یہ وقت ہوگا جب فرد دینی اعتبار سے گرنا شروع ہوگا، سیکھنے کا عمل سے گہرا تعلق ہے، بزرگوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ ہمیں اگر بچے یا عام آدمی سے کام کی بات ملتی ہے تو ہم اسے اپناتے ہیں، اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اتنی اچھی بات ہمارے ذہن میں کیوں موجود نہیں تھی؟

بات یہ ہے کہ انسان کا ذہن ہمہ جہتی صلاحیتوں کا حامل نہیں ہے، معاملات اور مسائل کے کئی پہلو ایسے ہوتے ہیں، جو ذہن سے پوشیدہ ہوتے ہیں، یہ انسان کی عبدیت کی علامت بھی ہے کہ وہ علمی و عملی اعتبار سے عاجز ہے اور کلی صلاحیتوں کا حامل ہر گز نہیں ہے۔

اللہ نے دنیا کا یہ نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ فرد ایک دوسرے سے سیکھ کر ہی آگے بڑھتا ہے اور دینی معاملات میں ارتقا کرتا ہے۔

جب فرد سیکھنے کا باب بند کر دیتا ہے تو وہ بند گلی میں پھنس جاتا ہے اور عملی اعتبار سے بھی کوتاہ واقع ہونے لگتا ہے، اس لئے ہر وقت سیکھنے کے باب کو کھلا رکھنا چاہئے، بالخصوص بزرگوں کے حالات واقعات اور ان کے اقوال اور ان کے کردار سے سیکھنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے، اس سے منکسرانہ مزاج پیدا ہوتا ہے، جو اللہ کو بہت زیادہ پسند ہے، اس منکسرات مزاج کی وجہ سے اللہ بندہ کو ہدایت کی راہ پر گامزن رکھتا ہے۔

الغرض یہ کہ سیکھنے کا عمل دینی معاملات میں آگے بڑھنے کی خاطر ہونا چاہئے، نہ کہ دنیا بنانے کے لئے، دنیا بنانے کے لئے بھی سیکھنا چاہئے، لیکن دنیا عارضی چیز ہے، اصل چیز دین ہے جو ابدی زندگی میں کام آئے گا، دین میں ارتقا سیکھتے رہنے کے مزاج سے ہی حاصل ہوگی۔

بدقسمتی سے اس دور میں تھوڑا سا علم حاصل ہونے کے بعد فرد یہ سمجھتا ہے کہ اب وہ اس مقام پر فائز ہے، جہاں دوسروں کو اس سے حاصل کرنا چاہئے، وہ مزید حاصل کرنے کے مرحلوں سے گزر چکا ہے، بالخصوص بزرگوں کو تو وہ کوئی حیثیت دینے کے لئے ہی تیار نہیں، اس ذہن اور مزاج کا نتیجہ ہے کہ عمل کی صلاحیت مفقود ہوتی جارہی ہے اور سیکھنے کو محض الفاظ کے علوم تک محدود رکھا جارہا ہے، جو بڑی محرومی کی بات ہے۔

احساس تنہائی کی بڑھتی ہوئی بیماری

مغرب کی مادی تہذیب کے زیر اثر ایک بیماری جو ہمارے ہاں پیدا ہورہی ہے، وہ احساس تنہائی کی ہے، اگرچہ مغرب میں احساس تنہائی آخری حد تک ہے، جب کہ ہمارے ہاں یہ ابتدائی مرحلے میں ہے، احساس تنہائی کا مطلب یہ ہے کہ فرد محسوس پہنچ چکی لگے کہ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے، نہ تو اس کا کوئی مخلص دوست وساتھی ہے، جس سے وہ اپنی مشکلات بیان کرکے اس سے ہمدردی کی توقع رکھی جائے اور نہ ہی اس کا کوئی سہارا ہے، یہ دنیا مفاد پرستی اور اغراض پرستی پر مبنی ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں، یہ احساس لوگوں کو زندگی سے مایوسی کی طرف لے جاتا ہے اور لوگ زیادہ وقت نشے کی حالت میں گزارنے لگتے ہیں، تاکہ ذہن منجمد رہے اور احساس کی شدت کی وجہ سے وہ شدید ذہنی اذیت کا شکار نہ ہوں۔

یہ احساس تنہائی دراصل مادی تہذیب کا خاصہ ہے، اس لئے کہ دنیا میں فرد کا سب سے بڑا سہارا اللہ کی ذات ہے، جب اللہ کی ذات پر یقین ہی نہ ہو، بلکہ اس کا انکار ہو تو یہ احساس جس قدر بھی طاقتور صورت اختیار کرے کم ہے، اس صورت میں ماں باپ، اور عزیز واقارب کے ہونے کے باوجود ہر فرد تنہائی کے شدید احساس کے زیر اثر رہنے لگتا ہے۔

ہمارے ہاں بھی جوں جوں دین ومذہب سے دوری ہوتی جارہی ہے، اسی قدر احساس تنہائی کی بیماری پیدا ہوتی جارہی ہے جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ بیماری مفاد پرستی اور اغراض پرستی کی عمومی فضا سے پیدا ہوتی ہے اور مذہب سے دوری اس بیماری میں اضافے کا ذریعہ بنتی ہے۔

ہم اگر چاہتے ہیں کہ اپنے لوگوں کو مغربی تہذیب کی پیدا کردہ احساس تنہائی کی بیماری سے بچا کر خود اعتمادی سے زندگی گزارنے کے سلیقے سے آشنا کریں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے میں دین ومذہب کی اہمیت کو اجاگر کریں اور اللہ سے تعلق پیدا کرکے شخصیت کو

داخلی طور پر مستحکم سے کریں، نفس پرستی، مفاد پرستی اور اغراض پرستی کا نتیجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں نکل سکتا، جو اہل مغرب میں پیدا ہوا ہے، اللہ کی ذات پر یقین ہونے سے دل اور روح کو وہ توانائی حاصل ہوتی ہے کہ فرد ہر طرح کے حالات میں داخلی اور خارجی طور پر مستحکم رہتا ہے۔

مغربی تہذیب نے جس طرح اہل مغرب سے اللہ کی ذات پر یقین کو متزلزل کیا ہے، اسی طرح اس تہذیب کے اثرات ہمارے ہاں اسی طرح کے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

حقیقی مسلمان تو احساس تنہائی کا شکار ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ وہ تنہائی سے تو نئی توانائی حاصل کرتا ہے، اس لئے کہ وہ تنہائی سے سب سے کٹ کر اللہ کا ہو جاتا ہے۔

واذکر سم ربک وتبتل الیہ تبتیلا۔

اور جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے، اور حدیث شریف آتا ہے، جس کا اللہ ہو جائے اسے کس چیز کی پرواہ ہے۔

دوسرے یہ کہ تنہائی اللہ سے اپنے ذاتی تعلق کو مستحکم کرنے کے لئے ہوتی ہے، جس سے اللہ کے ذکر کے لئے یکسوئی پیدا ہوتی ہے اور شخصیت اللہ کے انوار حسن سے بہرہ ور ہونے لگتی ہے، یہ تنہائی تو بہت بڑی نعمت ہے، جو خوش قسمت افراد ہی کو حاصل ہوتی ہے، اس تنہائی سے وہ توانائی حاصل ہوتی ہے جس سے فرد اللہ کے بندوں سے محض اللہ کی خاطر محبت کرنے لگتا ہے اور ان کے کام آنے لگتا ہے، تنہائی کی یہ صورتیں ہیں پہلی صورت عتاب ہے دوسری صورت انعام ہے۔

بے خدا تہذیب کے پیدا کردہ مسائل

والدین کو بوجھ سمجھنے کی نفسیات

بے خدا تہذیب نے جو مسائل پیدا کئے ہیں، ان میں ایک مسئلہ والدین کو بوجھ سمجھنے کی نفسیات ہے، حالانکہ اگر والدین کے احسانات کا شمار کیا جائے تو شمار سے زیادہ ہیں، والدین اپنی اولاد کے لئے تڑپتے رہتے ہیں، ان کی تکلیف اور دکھ کو دیکھنا نہیں چاہتے، ان کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں، ان کا دل ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

اگرچہ ہمارے ہاں اہل مغرب کی طرح والدین سے دوری اور ان کو بڑھاپے کی حالت میں بے سہارا چھوڑنے کی نفسیات میں کمی ہے، لیکن اس کا آغاز ہو چکا ہے اور اولڈ ہاؤس ہمارے ہاں بھی بننے لگے ہیں۔

اولڈ ہاؤس نہ بھی بنیں، لیکن اگر گھر میں بوڑھے والدین کی خبر گیری، ان کی خدمت اور ان کے آداب کی بجاآوری نہ ہو تو یہ بھی ایسی روش ہے جو نہ صرف اسلام کے منافی ہے بلکہ انسانیت کے بھی منافی ہے۔

والدین نے بچپن میں ہماری جو خدمت کی تھی، ہم اگر زندگی بھر ان کی خدمت کریں تو ان کی ایک خدمت کا بھی کفارہ ادا نہیں کر سکتے۔

بے خدا تہذیب بے رحم تہذیب ہے، اس تہذیب میں دل کے نام سے پاکیزہ احساسات وجذبات کی حامل کوئی چیز نہیں، اس لئے مغرب کی نقالی میں ہم اپنے بوڑھے والدین سے بیزار ہو کر ان کے لئے اولڈ ہاؤس میں داخلہ تجویز کریں گے تو ہمارا یہ عمل بد تہذیبی میں بھی شمار ہو گا تو خدا کے سخت عتاب کا بھی موجب ہو گا۔

اسلام میں والدین کی خدمت کی بے پناہ تاکید فرمائی گئی ہے، قرآن کہتا ہے کہ والدین کو اف بھی نہ کہو، یعنی ان کے ادب و آداب اور احترام میں اتنے آگے بڑھ جاؤ کہ ان کو اف تک نہ کہو۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ ایک نو عمر شخص نے حضور ﷺ سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ، میرے والد میرے پیسے لے جاتے ہیں، آپ نے ان کے والد کو بلایا پھر آپ نے ان کے بیٹے سے کہا کہ تم اور تمہارا مال تمہارے والد ہی کے ہیں۔

ایک حدیث شریف یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ ممبر پر تشریف لائے پہلے زینے پر قدم رکھا تو آمین فرمایا، دوسرے زینے پر قدم پر دوبارہ اور تیسرے زینے پر قدم رکھا تو تیسری بار آمین فرمایا، بعد میں صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آج ہم نے آپ کو معمول سے ہٹ کر آمین فرماتے ہوئے سنا، آپ نے فرمایا، میرے پاس جبریل آئے تھے، انہوں نے کہا کہ وہ شخص ہلاک ہو جو والدین کو بڑھاپے کی حالت میں پائے اور ان کی خدمت نہ کرے میں نے اس پر آمین کہا دوسری بات جبریل نے کہا وہ شخص ہلاک ہو جو آپ ﷺ کا نام سنے اور درود نہ پڑھے، میں نے اس پر بھی آمین کہا۔

جب انسانی معاشرہ دجل

سے عبارت ہو جائے تو دجال کا ظہور ہونا

اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو دھوکہ دے، وہ ہم میں سے نہیں، دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا دھوکہ دینے والا جہنم میں جائے گا، دھوکہ دہی بہت بُری صفت ہے، اس بُری صفت کی سب سے بڑی حامل شخصیت دجال کی ہے، دجال دھوکہ دہی سے اپنے آپ کو رب ظاہر کرے گا اور اس کے لئے طلسمات اور کرشموں سے کام لے گا، اس کی ساری شخصیت سراپا دجل و فریب سے عبارت ہو گی، وہ اپنی دھوکہ دہی کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے بلکہ خود انسانوں کے لئے بہت بڑی آزمائش ہو گا۔

دھوکہ دہی سے کام لے کر شہرت حاصل کرنا، لوگوں کی نظروں میں اپنا مقام بنانا، اپنے معتقدوں کا حلقہ تیار کرنا، اپنی نیکوکاری اور اپنے تقدس کو ثابت کرنے کے لئے کوشاں ہونا، اپنے کاروبار کو چمکانا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو دھوکہ دہی کے زمرے میں شامل ہیں۔

دجل اور دھوکہ دہی کی دو صورتیں ہیں، ایک اپنے حقیقی خالق و مولا سے دجل کا معاملہ کرنا، اس کی ذات کا انکار کر کے نفس کی خواہشات پر مبنی نظام قائم کرنا، اس نظام کو انسانی حقوق کے خوبصورت نام سے موسوم کرنا اور یہ کوشش کرنا کہ انسانیت اسی دھوکہ دہی پر مبنی نظام اختیار کرے، دجل اور دھوکہ دہی کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسانوں سے ہر سطح پر دھوکے اور فریب کا معاملہ کرنا، دجل اور دھوکہ دہی کی یہ دونوں صورتیں اس وقت انسانی سطح پر عام ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ جب انسانی معاشرہ دجل اور فریب سے مکمل طور پر عبارت ہو جائے گا تو اس سے دجال کی قوت ظاہر ہو گی، جو دجل اور فریب کے سارے حربوں کا مظہر ہو گی۔

بعض افراد میں دھوکہ دہی کی صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں، وہ اسی حساب سے لوگوں کو دھوکہ دے کر بڑا بننے اور مالدار بننے میں کامیاب ہوتے ہیں، دھوکہ دہی کی صلاحیتوں کے باوجود جو شخص اللہ سے خوف کی بنا پر ان صلاحیتوں کو پامال کرتا ہے، وہ خوش نصیب انسان ہے، بدقسمتی سے موجودہ دور کا عالمی نظام دھوکہ دہی پر مشتمل ہے، جس کی وجہ سے دھوکہ دہی کی وبا بڑھ رہی ہے۔

اس دور میں عالمی سطح پر ایک ایسا طاقتور گروہ پیدا ہو گیا ہے، جس نے اپنے ذاتی، گروہی اور قومی مفادات کی خاطر ایسا ریاستی نظام تشکیل دیا ہے، جس کے ذریعہ دھوکہ دہی سے قوموں اور ملکوں کو کنٹرول کیا جاتا ہے اور دنیا کو غلام بنا کر ان کے وسائل کو لوٹ رہا ہے اور دھوکہ دہی پر مبنی اس نظام کو قائم اور برقرار رکھنے کے لئے وہ سارے ذرائع و وسائل اور طاقت استعمال کر رہا ہے۔

یہ اس دور کے دجل و فریب کی سب سے انوکھی مثال ہے کہ انسانی حقوق، انسانیت اور آزادی کے خوبصورت نام پر قوموں کو غلام بنایا گیا ہے۔

دھوکہ دہی پر مشتمل یہی عالمی نظام ہے، جو دجال کے لئے حالات سازگار بنا رہا ہے اور اس کی پشت پناہی کا بھی کردار ادا کرے گا، اور یہ نظام دجال کے پیغام پہنچانے کے لئے اس کو ساری سہولتیں فراہم کرنے کے لئے کوشاں ہے، دجالیت پر مشتمل اس عالمی نظام کے فریب سے بچنا، اپنے ایمان کو بچانے کے مترادف ہے۔

اس سلسلے میں جو احادیث پیش کی گئی ہیں، وہ بہت اہم نوعیت کی احادیث ہیں، دجل، مکر و فریب اور دھوکہ دہی کے چھوٹے واقعات بھی ایمان کے لئے خطرہ ہیں تو بڑے واقعات تو سرے سے فرد کے ایمان کو ضایع کرنے کا باعث ہیں، اللہ ہمیں چھوٹے اور بڑے دجل کے مظاہر سے بچائے اور ظاہر ہونے والے سب سے خطرناک دجال کے اثرات بد سے بھی ہماری حفاظت فرمائے۔

اقتدار اور دولت کی آزمائش

اگر یہ پوچھا جائے کہ دنیا میں سب سے بڑی آزمائش کیا ہے، جس میں افراد ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں تو کہا جائے گا کہ اقتدار اور کثرت دولت، یہ دونوں آزمائشیں ایسی ہیں، جس میں فرد آپے میں نہیں رہتا، اگر عدالتی نظام غیر مستحکم اور کمزور ہے تو ایسی صورت میں اقتدار اور کثرت دولت سے فرد و افراد ملک و ملت کو جتنا بھی نقصان پہنچائیں، کم ہے، سبب یہ ہے کہ ذہن اور مزاج میں توازن قائم نہیں رہتا، اور فرد و افراد اپنے آپ کو مختار کل سمجھکر دوسروں کو اپنا ماتحت سمجھنے کی نفسیات میں مبتلا ہوتے ہیں، اس سے احساس برتری و احساس بالاتری بھی پیدا ہوتی ہے، حدیث شریف میں ہے کہ تم امارت کے حصول کے لئے بے تاب رہو گے اور یہ قیامت کے دن پچھتاوے کا سبب بنے گی۔

دوسری حدیث شریف ہے کہ دو بھوکے بھیڑیے جو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے جائیں، اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے، جتنا فرد کے مال و منصب کے حصول کا لالچ اس کے دین کو نقصان پہنچا دیتا ہے۔

اس لئے صلحائے امت نے اقتدار اور کثرت دولت سے پناہ مانگی ہے۔

کسی قوم و ملت پر اللہ کا بڑا احسان یہ ہوتا ہے کہ اسے ایسی قیادت مل جائے جو اقتدار اور دولت کی ہوس سے محفوظ ہو، اس طرح کی قیادت سے قومی زندگی ہر طرح کے بحرانوں سے محفوظ ہوتی ہے، اس لئے کہ قیادت کی حکمت پر مبنی پالیسیوں اور اس کے اخلاص کی وجہ سے ریاست کے سارے شعبے صحیح سمت میں کام کرنے لگتے ہیں، دوسری صورت میں قوم و ملت نئے نئے بحرانوں سے دوچار ہوتی رہتی ہے اور دنیا و آخران کے لئے خسران سے بھی دوچار رہتی ہے۔

ہمیں اللہ سے یہی دعا کرتے رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اقتدار اور دولت کی ہوس سے محفوظ، مخلص اور ملت کا درد رکھنے والی قیادت عطا فرمائے۔

خیر اور شر کی

کشمکش کا جاری رہنا

خیر اور شر کی کشمکش شروع سے جاری رہی ہے اور اب بھی جاری ہے، فرق یہ ہے کہ اب یہ کشمکش بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔

خیر اور شر کی کشمکش سب سے پہلے فرد کی داخلی زندگی میں شروع ہوتی ہے، داخلی زندگی کے بعد یہ کشمکش خارجی زندگی کا رخ اختیار کرتی ہے، داخلی زندگی میں خیر کی صدائیں بھی آتی ہیں تو شر کی بھی۔ فرد اگر خیر کی صداؤں کو مسلسل نظر انداز کرنے لگتا ہے، تو اس سے رفتہ رفتہ اس پر شر کی قوتیں غالب آنے لگتی ہیں، خیر کی تیز صدائیں یہ ہوتی ہیں کہ خدا پرستی کی راہ اختیار کرو، لوگوں کی حق تلفی نہ کرو، معاشرے میں اچھا انسان بن کر رہو، خیر کے ہمنوا بن جاؤ، آخرت کی زندگی کی تیاری کرلو، اللہ سے محبت کی راہ اختیار کرو، وغیرہ وغیرہ، لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ فرد معاشرے کے اثراتِ بد اور نفس کی قوت کی وجہ سے خیر کی ان صداؤں کو ٹالتا رہتا ہے، جب ٹالنے کی اس کی یہ روش غالب آنے لگتی ہے تو شر کی قوتیں اسے پہلے مرحلہ پر حق کی طرف سے غافل کر دیتی ہیں، دوسرے مرحلہ پر اگر وہ صاحب دولت یا صاحب اقتدار ہے تو یہ غفلت اسے اس کشمکش میں شر کا طرفدار بنا دیتی ہے، اس طرح داخلی زندگی میں موجود شر خارجی زندگی میں شدت سے ظاہر ہونے لگتا ہے، اگر لوگوں کی زیادہ تعداد داخلی زندگی میں خیر کی قوتوں کو مفتوح کر کے شر کو غالب کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں، تو یہ شر خارجی زندگی میں معاشرے کو فساد سے بھر دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔

خیر اور شر کی کشمکش اس لئے ہوتی ہے، تاکہ کھرے اور کھوٹے انسانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا جا سکے، اللہ کے وفادار اور مخلص انسانوں اور سرکش انسانوں کو جدا کیا جا سکے، جنت کے مستحق اور جہنم کے مستحق انسانوں میں فرق کیا جا سکے۔

قرآن میں خیر اور شر کے علمبرداروں کے درمیان کشمکش کا بار بار ذکر ہے، قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ شر کی قوتوں کے سرخیل مقتدر طبقات ہی رہے ہیں، عام لوگ جن کا شر کی طرف رجحان رہا ہے، وہ مقتدر طبقات کی معیت میں رہے ہیں۔

موجودہ دور میں خیر اور شر کے درمیان کشمکش بہت زیادہ تیز ہے، سبب یہ ہے کہ مادی قوتوں نے ایسے آلات تیار کئے ہیں، جن کے ساتھ لوگوں کی ضرورتیں بھی وابستہ ہیں تو ساتھ ساتھ وہ آلات شر کو پھیلانے کا ذریعہ بھی ہیں، شر کے یہ آلات لگ بھگ ہر فرد کے گھر اور جیبوں تک پہنچ گئے ہیں۔

ان حالات میں خیر کے علمبرداروں کا کام زیادہ دشوار ہوگیا ہے، بلکہ خیر کے علمبرداروں کو خود ان آلات میں موجود شر کے اثرات سے بچنے کے لئے خصوصی اہتمام کی ضرورت ہے، اس لئے کہ نفس کی قوت اگرچہ پامال ہوگئی ہو، تاہم وہ موجود تو ہے، جو کسی محرک سے ابھر سکتی ہے، ہر وقت اللہ سے اس کے خصوصی فضل کی استدعا کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

روحانیت اور نفسانیت کو سمجھنے کی ضرورت

روحانیت کے بغیر فرد کا مردہ لاش کی طرح ہونا

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی تعلیمات کا ایک قابل ذکر حصہ روحانیت سے متعلق ہے، جس کا تعلق باطن کی وسیع دنیا کی اصلاح اور پاکیزگی سے ہے، تاکہ نفس کی قوتوں پر روحانی قوتیں غالب آجائیں، اسلام خود جامع اصطلاح ہے، جس میں روحانیت ازخود آجاتی ہے، لیکن جب اسلام کی تشریح ہوگی تو سمجھانے کی خاطر روح، روحانیت اور باطن میں موجود ہولناک روگوں کا ذکر ضرور آئے گا، روحانی بیماریاں یا باطن میں موجود روگ ایسے ہیں، جو اسلام اور اسلامیت کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان روگوں کی موجودگی میں نہ صرف ایمان کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے، بلکہ ایمان رسمی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

مولانا رومی نے فرمایا ہے، نفس پامال اور مطیع نہیں ہو سکتا، بزرگ کی صحبت کے بغیر، اس لئے کسی کامل فرد کے سامنے پیش ہو کر اپنے آپ کو پامال کردو، (تاکہ اپنی پامالی سے نیا طاقتور صاحب ایمان فرد وجود میں آسکے)۔

اقبال نے کہا ہے کہ روحانیت کے بغیر فرد مردہ لاش ہے، تقریباً سارے بزرگوں نے روحانی قوت کو نفس کی غلامی سے آزادی دلا کر اسے اسلام ہمہ آہنگ بنانے کے لئے اس طرح کی باتیں کہی ہیں۔

جدید انسان اس اعتبار سے قابل رحم ہے کہ وہ صلحائے امت کی اس طرح کی باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے، اور اس اعتبار سے وہ بزرگوں کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی نفس اور نفسیات کو جس طرح سلف صالحین، بزرگان دین اور صلحائے امت نے سمجھا ہے، جدید انسان اس کے ایک فی صد حصہ کو بھی نہیں سمجھ سکا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ نفس کی تخلیق کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ وہ بہت زیادہ پیچیدگیوں اور مکر وفریب سے عبارت ہے، نفس کی دنیا میں طویل عرصہ تک غوطہ زنی اور خود شناسی اور خدا شناسی کے مسلسل عمل کے بغیر نہ تو نفس کی قوتوں کو سمجھا جا سکتا ہے اور ہی روح کے تقاضوں کو۔

نفس اور روح کے درمیاں گہرا تعلق ہے، جب نفس طاقتور ہوتا ہے تو روح نہ صرف کمزور ہو جاتا ہے، بلکہ اس کی مثال مردہ لاش کی سی ہو جاتی ہے، جب روح طاقتور ہوتا ہے اور اس کا اپنے مولا سے تعلق مستحکم سے مستحکم ہوتا ہے تو نفس کی قوتیں پامال ہونے لگتی ہیں اور اس کی شرارتوں اور مکر وفریب کا باب بند ہونے لگتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بندہ مومن کا اصل کام یہ ہے کہ وہ نفس کی قوتوں پر روحانی قوتوں کو غالب کرنے کے لئے کوشاں ہو، اس سے نفس کی قوت پامال ہو کر اللہ اور اللہ کے رسول کی مخلصانہ اطاعت کے لئے آمادہ ہوگی، بالخصوص نفس کی دنیا میں دنیا طلبی، اقتدار طلبی، اور اپنی شخصیت پرستی، جیسے بہت سارے باطل جذبات موجود ہیں، جو فرد کے لئے اللہ کی بارگاہ تک رسائی کی راہ میں شدید رکاوٹ ہیں، ان سے نجات کی صورت پیدا ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی معاشرے کا سارا فساد نفس اور روح کی قوتوں کو نہ سمجھنے اور اس کی اصلاح سے بے نیازی ہی کا نتیجہ ہے۔

نفس اور روح کی قوتوں کو سمجھنے کے لئے نفس اور روحانیت کے ماہروں کی صحبت کی ضرورت ہے، تاکہ وہ اپنی نورانی شعاؤں کے ذریعہ باطن میں جو ہمہ جہتی پردے اور حجاب

پڑ گئے ہیں، ان حجابوں کو مسلسل صحبت کے ذریعہ دور کر سکیں اور مجاہدوں کے ذریعہ فرد کو نفس مطمئنہ کی راہ پر گامزن کر سکیں۔

اس نکتہ کو نہ سمجھنے میں کہیں تو ضد کار فرما ہے، کہیں عقلیت اور عقل پرستی کے حجابات اور غلط فہمیاں، لیکن ہمیں اپنی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے ان حجابات سے بلند ہو کر حقیقت کو سمجھنا ہوگا، قرآن کی آیت ہے **یاایھا الذین آمنوا اتقواللّٰہ وکونوا مع الصٰدقین**۔ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور صادقین کی معیت اختیار کرو، صادقین وہ ہوتے ہیں جو اخلاص کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں اور قول اور عمل کے تضاد سے محفوظ ہو کر اللہ سے کامل طور پر وفادار ہوتے ہیں، جو دنیا و مال و متاع سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری باطنی آنکھوں کو بیدار کر کے ہمیں حقیقت تک پہنچا دے۔

(آمین)

آزادی اور غلامی کا فلسفہ

(ہماری اپنی ملت کے حالات کی روشنی میں)

آزادی بڑی نعمت ہے، جس کی قدر کرنی چاہئے، اس لئے کہ آزادی سے اپنی تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرنے میں آسانی ہوتی ہے، اس طرح اپنی تہذیب کو فروغ ملتا ہے، لیکن آزادی کے فلسفہ کو سمجھنا ضروری ہے، آزادی کی تین قسمیں ہیں۔ نفس کی غلامی سے آزادی، غالب قوموں کی عملی اور ذہنی غلامی سے آزادی، مطلق العنان بادشاہوں اور آمریتوں سے آزادی، جو ملت ان تینوں قسم کی غلامی سے آزاد ہو، وہ سب سے زیادہ خوش نصیب ملت ہے، قومیں اس طرح کی ملت سے وابستہ ہو کر اس کے ماتحت کام کرنے کو اپنی سعادت سمجھتی ہیں، جس طرح قرون وسطیٰ میں ہوا۔

سب سے پہلی آزادی نفس کی غلامی سے آزادی ہے، نفس کی غلامی دراصل نفس پرستی کی صورت ہوتی ہے، نفس پرستی سے اعضائے جسم زنجیروں کے شکنجے میں کس جاتے ہیں، جس سے آزاد ہو کر کام کرنا، افراد کے لئے ممکن نہیں ہوتا، خواہشات کی غلامی بدترین غلامی ہوتی ہے۔ جس سے ساری انفرادی و اجتماعی زندگی نفس پرستی کی بنیادوں پر استوار ہونے لگتی ہے، رشوت، غبن، لوٹ مار، دھوکہ دہی، قومی خزانہ کی خرد برد، عدالتوں سے انصاف کا ناپید ہونا، دوسروں کی حق تلفی، سرکاری اہل کاروں کی اپنی منصبی ذمہ داریوں سے غفلت، جھوٹ، وعدہ خلافی، ہر طبقہ کی طرف سے دنیا کو مقصود بنانا وغیرہ یہ ساری چیزیں نفس پرستی اور نفس کی غلامی کا نتیجہ ہوتی ہے، ایسی قوم آزادی کے قابل ہی نہیں ہوتی، اس پر غلامی مسلط کر دی جاتی ہے۔

دوسری غلامی طاقتور قوم (جو کچھ اخلاقی پابندیوں کی حامل ہوتی ہے، جس کی عدلیہ آزاد ہوتی ہے، جو قومی سطح پر لوٹ مار اور رشوت کی روایت سے محفوظ ہوتی ہے) کی غلامی ہوتی ہے، جو انگریز قوم کی غلامی کی صورت میں ہم بھگت چکے ہیں، یہ غلامی اس اعتبار سے سخت ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے ہماری پاکیزہ تہذیب اور اس کے اداروں کو مکمل طور پر ختم کر کے حکومت کی طاقت کو اپنی مادی تہذیب کو مسلط کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور ہماری تعلیمی اور تربیتی نظام پر اپنے مادہ پرستی پر مبنی تربیتی نظام کو قائم کیا جاتا ہے۔

اس طرح کی غلامی قدرت کی طرف سے بہت بڑی سزا ہوتی ہے، اس لئے کہ اس سے ذہنی غلاموں کی فوج در فوج تیار ہوتی رہتی ہے، جو سرے سے اپنی پاکیزہ تہذیب سے ہی ناآشنا ہوتی ہے۔

خواہشات کی غلامی کے ساتھ اگر طاقتور مادہ پرست قوم کی بھی غلامی ہو جائے تو یہ دگنی سزا ہوتی ہے۔

غلامی کی تیسری شکل آمریتوں کی شکل میں ہوتی ہے کہ آمریتیں قوم پر اپنے حکم کو قانون کی صورت میں مسلط کرتی ہیں، یعنی ان کا حکم ہی قانون ہے، اس طرح قوم آمریتوں کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

جو قوم اور ملت ان تینوں قسم کی غلامی کے شکنجے میں کسی ہوئی ہو، وہ ملت انتہائی قابل رحم ہوتی ہے، اگر اللہ کو رحم آجائے اور اس قوم کو بہتر، دیانتدار، نڈر اور قومی درد سے سرشار قیادت نصیب ہو جائے تو اس قوم و ملت کی حالت میں بہتری کی صورت پیدا ہو سکتی ہے، اللہ کی ذات سے امید ہے کہ ہماری حالت زار پر رحم فرما کر ہمیں اپنے فضل خاص سے اس طرح کی قیادت عطا فرمائے گا۔

ایمان و عقیدہ کی قوت
اور اس سے کام نہ لینے کا نتیجہ

مسلمانوں کے پاس ایمان و یقین کی قوت موجود ہے، جو ناقابل تسخیر ہے، اس قوت کی موجودگی میں مسلمان محتاج ہوں اور دوسروں کے ماتحت ہوں اور ان سے خوف زدہ ہوں، یہ ایسی باتیں ہیں جو ایمان و یقین کے منافی ہیں، ایمان و یقین کے ساتھ اگر پختہ کردار کی رونق موجود ہو، اللہ کی ذات پر بھروسہ ہو، اسلامی تعلیمات کے لئے جوش و خروش ہو تو ایسی ملت دوسروں کے ماتحت ہونے کے بجائے ان کو اپنے ماتحت بنانے اور ان کو اپنے نظریے سے ہمہ آہنگ بنانے کی صلاحیتوں کی حامل ہو جاتی ہے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کی ساری زبوں حالی اور محتاجی ایمان و یقین پر محنت نہ کرنے اور ذاتی مفادات کا اسیر بننے ہی کا نتیجہ ہے۔

بالخصوص مقتدر طبقات نے اسلام پر دولت و دنیا کو ترجیح دے کر، ملت کو پامالی کی راہ پر ڈال دیا ہے اور اپنے منفی کردار سے عام لوگوں کو بھی اسی روش پر ڈال دیا ہے۔

اب حالات سب کے ہاتھوں سے نکل رہے ہیں، امن و امان کی صورتحال دگرگوں ہے، مہنگائی بڑھ رہی ہے، لوگ بھوکوں مر رہے ہیں، خودکشیاں ہو رہی ہیں، صورتحال اس قدر خراب ہونے کے باوجود مقتدر طبقات بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں، معلوم ہوتا ہے وہ سنگ دلی میں انتہا پر پہنچ چکے ہیں، ایمان و یقین پر محنت نہ ہو گی تو اس کا نتیجہ اس کے علاوہ دوسرا کوئی نکل ہی نہیں سکتا۔

ایمان اور عقیدہ کی قوت کے باوجود دوسروں سے مالی وسائل اور نظریات کی بھیک مانگنا اور ہر معاملے میں ان کی تقلید اختیار کرنے کو ترقی پسندی سمجھنا، یہ غلامانہ ادائیں ہیں اور اپنے نظریے سے بے وفائی بھی۔

غیر مسلموں تک ایمان وعقیدہ کی دعوت پہنچانا، یہ مسلمانوں کی منصبی ذمہ داری ہے، یہ منصبی ذمہ داری پوری کرنا تو دور کی بات ہے، الٹا غیروں کے مادی نظریات سے متاثر اور مرعوب ہونا، یہ ایسی بات ہے جو اللہ کی سزا کا مستحق بنانے کا باعث ہے۔

مسلمانوں میں الحمدللہ ایمان عقیدہ پر محنت بھی ہو رہی ہے، دینی طبقات اس سلسلے میں مصروف عمل ہیں، لیکن ریاستی وسائل اور اداروں کے اختیارات جن افراد کے ہاتھ میں ہیں وہ اکثر دنیا، مادیت اور مفادات کے اسیر ہیں، اس لئے وہ اس طرف آنے کے لئے تیار نہیں، یہ روش ایسی ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ کی روش ہے۔

اگر مقتدر طبقات ایمان وعقیدہ کی دعوت کو اپنائیں تو ہماری قسمت بدل سکتی ہے۔

نظام کی تبدیلی کی کاوشوں کے ساتھ
اصلاح اعمال کی ضرورت

ہماری قومی زندگی نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے فاسد نظام کے زیر اثر رہی ہے، اس کی وجہ سے بہت کچھ بگڑ چکا ہے، مزاج اور ذہنیت تبدیل ہو گئی ہے، کھانے پینے اور قومی خزانہ پر ہاتھ صاف کرنے والی قوتیں، طاقتور ہو چکی ہے، عدلیہ کا نظام کمزور ہو چکا ہے، سیاسی قیادت کو دولت کمانے کے علاوہ کسی چیز کے فکر لاحق نہیں ہے، ان حالات میں نظام کی تبدیلی کا کام یقیناً اہمیت کا حامل کام ہے، جو یہ کام کر رہے ہیں، وہ قابل قدر ہیں، اچھی بات جو ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ سیاسی بیداری اور شعور میں پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، اشرافیہ کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے، لیکن نظام کی تبدیلی کے ساتھ جس کام کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ اصلاح اعمال کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ ہو، اعمال کا مطلب یہ ہے کہ قومی زندگی میں اخلاقی اور روحانی تبدیلی کا شعور اور احساس پیدا ہو، اس لئے کہ معاشرہ اگر بُرائی کو بُرائی سمجھکر اس سے خود بھی بچنے کے لئے تیار ہو، ساتھ ساتھ بُرائی کے خلاف مزاحمت کے لئے تیار ہو، اور یہ سارا کام اللہ کی رضامندی کے تحت ہو تو اللہ کی غیبی مدد آتی ہے اور نظام کی تبدیلی کے لئے اللہ کی طرف سے حالات سازگار ہونے لگتے ہیں اور قیادت بھی فراہم ہو جاتی ہے اور یہ سب کچھ اصلاح اعمال کے جذبہ کے تحت ہی ہوتا ہے۔

حجاج کا واقعہ ہے کہ اس کے مظالم کے خلاف کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ لوگ اس وقت کے سب سے بڑے بزرگ حسن بصری کے پاس بھی گئے کہ وہ اس سلسلے میں ان کا ساتھ دیں، حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ حجاج ہمارے اعمال کی شامت ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم اصلاح اعمال کے ذریعہ اللہ کی طرف رجوع ہوں اور اجتماعی طور پر اللہ سے معافی مانگیں، اگر ایسا کرنے کے بجائے حجاج کے خلاف خروج کریں گے تو یہ اپنے اعمال کی شامت کے منافی

کام ہوگا، اللہ کی سزا کے جواب میں رجوع الی اللہ کی بجائے اس سزا کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا اپنے اعمال سے غافل ہونا ہے۔

ہم لگ بھگ پچھلے ساٹھ سال سے جس بحراں سے دوچار ہیں، وہ بحران یہ ہے کہ ہمارے ہاں عوامی سطح پر خیانت، بددیانتی، ملاوٹ، دولت پرستی کے میلانات، دوسروں کو دھوکہ دے کر مال کمانے کی روش اور اللہ سے دوری کی حالت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، اس طرح کے حالات میں جب تک اعمال کی تبدیلی کے لئے تحرک پیدا نہ ہوگا، تب تک حالات اور نظام کی تبدیلی کا عمل مشکل ہے، البتہ اتنا ضرور ہوگا کہ نظام کی تبدیلی سے حالات میں کچھ نہ کچھ بہتری پیدا ہوگی۔

معافی اور درگذری کی صفت کا مفقود ہونا

اس دور میں معافی اور درگذر کی صفت میں کافی کمی واقع ہوئی ہے، جس کی وجہ سے ہر سطح کے افراد کے تعلقات میں کشیدہ پیدا ہوئے ہے۔

غصہ اور جھنجھلاہٹ میں اضافہ ایسی چیز ہے، جس سے وحدت کا عمل بُری طرح متاثر ہوتا ہے، اقربا اور دوستوں کے درمیاں تعلقات متاثر ہوتے ہیں، اس طرح افراد رفتہ رفتہ احساس تنہائی کی طرف جانے لگتے ہیں، اور احساس تنہائی سے ذہنی دباؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔ معافی اور درگذری ایسی وصف ہے، جس سے دلیں جڑتی ہیں، باہمی محبت پیدا ہوتی ہے، ایک دوسرے سے قریب ہو کر ان کے دکھ درد میں شرکت کا عمل ہوتا ہے۔

حدیث شریف ہے جو لوگوں کے قصوروں کو معاف کرتا ہے، اللہ ان سے درگذر کا معاملہ فرماتا ہے، دوسری حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی عزت میں اضافہ کرتا ہے جو دوسروں سے عفوودرگذر سے کام لیتا ہے۔

معافی اور درگذری کے مزاج کی اہمیت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ کی طرف سے ایسے شخص کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے، دیکھا گیا ہے کہ جو شخص بھی اس صفت کا حامل ہوتا ہے، اس سے لوگ دل سے محبت کرنے لگتے ہیں، اس لئے کہ یہ عمل اتنا دشوار ہے کہ نفس پر سب سے زیادہ شاق گذرتا ہے کہ ایک شخص نے میری بے عزتی کی ہے، میرے وقار پر ضرب کاری لگائی ہے، میں اسے کیسے معاف کروں، اس بلند ظرف کے لوگ معاشرے کا سرمایہ ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کی برکت سے سماجی، معاشرتی اور خاندانی سطح پر وحدت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

مزاجوں کی سختی ایسی چیز ہے جو نفس کی بُری کارروائی ہوئی ہے، دوسروں کی سخت باتوں یا سخت رویہ سے افراد کے دلوں میں کینہ پیدا ہونے لگتا ہے، اس کینہ کو اللہ کا ذکر ہی دور کر سکتا ہے کہ ذکر سے دل نرم ہونے لگتا ہے اور سخت مزاج کے حامل افراد کو قابل رحم سمجھکر فرد دل سے معاف کرنے لگتا ہے۔

آداب سے خالی طرز زندگی

ہر تہذیب کے اپنے آداب ہوتے ہیں، مسلم معاشرے کے بھی آداب رہے ہیں، جو اب رخصت ہورہے ہیں، ان آداب میں ملنے کے آداب، رابطے کے آداب، تعلقات کے آداب، گفتگو کے آداب، مہمان نوازی کے آداب، عزیز واقارب اور دوست واحباب سے تعلقات کے آداب، سماجی ومعاشرتی نوعیت کے آداب وغیرہ شامل ہیں، ان سارے آداب میں محبت اور احترام کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں، جس سے دلیں ایک دوسرے سے جڑی رہتی ہیں، اس طرح معاشرہ خیر سگالی سے عبارت ہونے لگتا ہے، یہ سارے آداب ایسے ہیں جن کی تعلیمات بالخصوص احادیث میں تفصیل سے بیان فرمائی گئی ہیں۔

جب تزکیہ اور اخلاص کی حالت موجود ہوتی ہے تو اس طرح کے سارے آداب کا ادراک بھی ہونے لگتا ہے تو ساتھ ساتھ ان کو بجالانے کا سلیقہ بھی آجاتا ہے۔

اب جب ہمارا معاشرہ تزکیہ اور اخلاص سے بڑی حد تک تہی دست ہوتا جارہا ہے تو ان آداب سے بھی محرومی ہوتی جارہی ہے، جس سے معاشرے میں بے حسی، بے بسی اور احساس تنہائی پیدا ہوتا جارہا ہے۔

آداب کے بغیر نہ تو اپنی پاکیزہ تہذیب کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور نہ ہی سلیقہ انسانیت سے بہرہ وری ہوسکتی ہے۔

مادیت پسندانہ طرز زندگی یا جذبات محبت سے خالی زندگی سے آداب حاصل نہیں ہو سکتے، بلکہ ایک دوسرے سے دوری اور بے زاری ہی کی فضا پیدا ہوسکتی ہے۔

برکت کے نظام سے محرومی کا المیہ

ہمارا موجودہ دور عام طور پر برکت کے نظام سے محرومی کا دور ہے، اس دور بے برکتی عام ہے، وقت میں بے برکتی، مال میں بے برکتی، جان میں بے برکتی۔

وقت میں بے برکتی ایسی ہے کہ صبح ہوتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے رات آجاتی ہے، رات آتی ہے تو تھوڑی نیند کرنے کے بعد صبح آجاتی ہے، اس طرح وقت سے برکت ختم ہوگئی ہے، فرد حیران ہوتا ہے کہ اس مختصر وقت میں کیا کیا کام کئے جائیں، البتہ عبادت، ذکر وفکر اور تلاوت کے وقت، وقت میں برکت آجاتی ہے کہ آدھا گھنٹہ گزرنے ہی نہیں پاتا تو محسوس ہوتا ہے کہ گویا ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔

مال میں بے برکتی اس طرح ہے کہ جتنا بھی مال آتا ہے یا تو اس سے فرد کی ضروریات بمشکل پوری ہو پاتی ہیں، یا پھر فرد محسوس کرتا ہے کہ یہ مال اس کے لئے ناکافی ہے۔

جان میں بے برکتی اس طرح ہے کہ اس دور میں لگ بھگ ہر فرد کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہے، ایسی ایسی نئی بیماریاں وجود میں آئی ہیں، جن کا اس سے پہلے نام بھی نہیں سنا تھا، پھر کافی بیماریاں ایسی ہیں جن کا کوئی علاج ہی نہیں ہے، فرد کو ساری زندگی ان بیماریوں سے نبھانا پڑتا ہے۔

زندگی میں یہ بے برکتی دراصل اجتماعی بداعمالیوں ہی کا نتیجہ ہوتی ہے جس کی قدرت کی طرف سزا اس طرح ملتی ہے کہ افراد بیماریوں سے نڈھال رہنے لگتے ہیں۔

بے برکتی سے نکلنے کی ایک بڑی صورت یہ ہے کہ وقت مال اور جسمانی صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہو، قابل ذکر وقت اور صلاحیتیں نفس کو پامال کرکے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں دینے اور دین کی خدمت میں صرف کرکے ہم اس بے برکتی کی صورتحال سے نکل سکتے ہیں۔

برکت ایسی چیز ہے جو دکھائی نہیں دیتی، لیکن برکت سے بڑے بڑے کام آسان ہونے لگتے ہیں، تھوڑے سے وقت میں بہت زیادہ کام ہونا، تھوڑے سے مال سے زیادہ ضرورتوں کا پورا ہونا، جسمانی بیماریوں کے باوجود شکر کے جذبات سے سرشار ہو کر دینی خدمت کا زیادہ کام کرنا، یہ برکت کے ثمرات ہیں۔

اس طرح کے افراد جن کے ساتھ اللہ کی برکت کا نظام شامل ہوتا ہے، ان کے کام دیکھکر یوں محسوس ہوتا ہے گویا ایک فرد کا کام نہیں، پورے ادارہ کا کام ہے، جو اللہ نے ایک فرد سے لیا ہے، برکت کے نظام کا حصہ بننے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ غیر ضروری باتوں اور کاموں میں توانائیاں صرف نہ کی جائیں، اس سے توانائیوں کا ایک ہدف متعین ہوتا ہے اور وقت بہت سارے کاموں میں ضایع ہونے سے بچ جاتا ہے اور ذہنی اور وجدانی طور پر یکسوئی پیدا ہونے لگتی ہے۔

اللہ کے سایہ رحمت میں داخل ہونے کی دعوت فکر

ہمارے حالات خراب ہیں، ہم بھیک مانگ کر گزارہ کر رہے ہیں، بھیک مانگنے والوں کی زندگی کیا ہوتی ہے، محتاجی اور سراپا محتاجی۔ ہمارے لئے عزت اور خودداری کے ساتھ زندگی گزارنے کی بہترین صورت موجود ہے، وہ صورت یہ ہے کہ ہم اللہ کے سایہ رحمت میں آجائیں، اس کا راستہ یہ ہے کہ ایمان اور تقویٰ کی زندگی اختیار کریں۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے لئے رحمت کے دروازہ کھولنے کا وعدہ فرمایا ہے **ولوان اھل القریٰ آمنو واتقوا لفتحنا علیھم برکاۃ من السمآء والارض** (الاعراف آیت ۹٦)

(اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔)

قرآن میں اس طرح کی کچھ اور بھی آیتیں ہیں۔ جن میں ایمان اور تقویٰ سے اللہ کی مدد ونصرت اور محتاجی دور کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، ایمان کا مطلب ہے اپنی زندگی اور اپنے اعمال کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنا، تقویٰ کا مطلب ہے پرہیزگاری کی راہ اختیار کرنا اور گناہوں سے بچ کر اللہ کی شان عظمت سے لرزتے رہنا۔

غلامی، طاقتور قوموں کی ہو یا عادتوں کی غلامی، غلامی غلامی ہے، اس طرح کی غلامی سے نجات حاصل کر کے اپنے آپ کو اللہ کی غلامی میں دینا اور خالص ایمان اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرنا، اس لئے ضروری ہے کہ ہمارا سارا زوال اسی غلامی ہی کا نتیجہ ہے، غلامی کی اس حالت سے نکلنے کے لئے جتنی بھی قربانی دینی پڑے، وہ دینی چاہئے۔

جب اللہ نے مذکورہ آیت اور اس طرح کی دوسری آیتوں میں ہماری ساری ضروریات کی تکمیل اور سایہ رحمت میں داخل ہونے کا وعدہ فرمایا ہے تو پھر حوصلے اور ہمت سے کام لے

کر ہمیں اپنے آپ کو اللہ کی نصرت کا مصداق بنانا چاہئے، ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خالص ایمان والی زندگی اختیار کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ طاقتور قوموں یا عادتوں کی غلامی آخر کب تک، جب اس غلامی کے نتائج ہماری قومی وملی زندگی میں شدید انتشار اور بحرانوں کی صورت میں ظاہر ہو چکے ہیں اور ہم پچھلے طویل عرصے سے مسلسل بحرانوں سے دوچار ہیں تو اب تو ہمیں اپنی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے اللہ کے وعدہ پر بھروسہ کرکے قومی زندگی میں خالص ایمان اور تقویٰ کے لئے حالات کو سازگار بنانے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔

غلامی کا نتیجہ افلاس فکر اور افلاس عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، ایسی قومیں دنیا وآخرت میں شدید عتاب کا شکار ہوتی ہیں، اللہ ہمیں اس افلاس فکر وافلاس سے نکل کر فلاح کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دے رہا ہے، اللہ کی دعوت قبول کرنے والوں کے لئے ہی سرفرازی کی راہ کھول دی جاتی ہے۔

عادتوں وغیرہ کی غلامی سے بچنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نفس کی قوتوں کی طرف سے ہے کہ نفس اللہ سے تقویٰ کی راہ اختیار کرنے نہیں دے رہا ہے، لیکن ہم اگر پختہ عزم کرلیں اور بدلنے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو اللہ سچی طلب والوں کے لئے راستہ کھول دیتا ہے اور ان کی بہتر سے بہتر اصلاح کی صورتحال پیدا کردیتا ہے، اور انہیں تقویٰ کی راہ پر گامزن کردیتا ہے۔

کمی طلب، عزم اور حوصلہ کی ہے۔

بے حسی کی بڑھتی ہوئی صورتحال

ہمارا ایک مسئلہ بے حسی کی حالت کا پیدا ہونا ہے، دینی اور ملی معاملات میں جب بے حسی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ قساوت قلبی آجاتی ہے، قساوت قلبی، دل کا صحیح سمت میں کام نہ کرنے اور اللہ سے دور ہونے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

بے حسی کی حالت جب غالب ہو جاتی ہے تو سننے سمجھنے کی صلاحیت سلب کرلی جاتی ہے، فرد بظاہر تو ذہین اور باصلاحیت ہوتا ہے، لیکن دینی اور ملی معاملات کے حقیقی فہم کے بارے میں وہ اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے، قرآن میں اس طرح کی بہت ساری آیتیں ہیں جو کفار اور مشرکین اور منافقین کے بارے میں ہیں، ہم ان آیات کو مسلمانوں سے لاگو تو نہیں کرسکتے، لیکن غیروں کی صفات اختیار کی جائیں گی تو ان سے مشابہت تو کسی حد تک پیدا ہو ہی جاتی ہے۔

بے حسی کی حالت جب مقتدر طبقات میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے ریاست کا رخ غلط سمت میں مڑ جاتا ہے، جو ملت کے لئے سب سے بڑا المیہ ہوتا ہے۔

بے حسی دراصل نفس پرستی اور اغراض ومفادات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس سے دلوں میں کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ **فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم** (پس جب انہوں نے کجی اختیار کی تو ہم نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کردیا)۔

یہ ایسی حالت ہوتی ہے جو اللہ کے عتاب کی صورت ہوتی ہے۔

بے حسی کے مقابل حساسیت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، حساسیت اگر دینی اور ملی معاملات کے لئے ہو تو یہ بڑا انعام ہوتی ہے، اس حساسیت سے کجی کی حالت دور ہو کر حق وصداقت کی راہ کھل جاتی ہے اور حکمت وبصیرت کے ساتھ معاملات سلجھانے اور سرانجام

دینے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور اعضاو جوارح صحیح سمت میں (حق کی سمت میں) کام کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہو جاتے ہیں۔

حساسیت دنیاوی معاملات کے سلسلے میں بھی ہوتی ہے کہ نفس دنیا کے بارے میں زیادہ حساس ہوتا ہے، یا اپنے مخالفین کے سلسلے میں اس کا احساس بہت زیادہ منفی ہو جاتا ہے۔ یہ حساسیت منفی نوعیت کی ہوتی ہے، جب کہ اسلام کو جو حساسیت مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ فرد نفس کی قوت کو قابو کرنے اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے سلسلے میں متحرک اور فعال ہو، اور اس کا دل اتنا بیدار ہو کہ معمولی گناہ بھی اسے چوکنا کر دے۔

فتنوں سے بچنے کی صورت

ہم جس دور میں رہ رہے ہیں، وہ طاقتور فتنوں کا دور ہے، عالمی سطح پر دجال کے لئے تیزی سے حالات سازگار ہو رہے ہیں، ذہنوں اور دلوں کو کنٹرول کرنے کے لئے جو آلات ایجاد ہو چکے ہیں، وہ تو بتا رہے ہیں کہ دجال کا ظہور کوئی زیادہ دور کی بات نہیں ہے، نیک افراد بھی روزانہ وقت کا کافی حصہ خوبصورت موبائل پر ضایع کر دیتے ہیں، کوئی قوت ہے جو انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے، یہی قوت ہے جسے ہم دجالی تہذیب کی قوت کہہ سکتے ہیں۔

ہماری نئی نسلیں جس کی اٹھان موبائل کے ماحول میں ہوئی ہے، وہ سخت ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔

جب دلوں اور ذہنوں پر مادہ پرست قوتوں کا کنٹرول ہونا شروع ہو جائے تو پھر کیا باقی بچیگا۔

ان خوفناک فتنوں سے بچنے کے لئے ایمان کی سادہ حالت کام نہیں دے گی، اس کے لئے طاقتور ایمان کی ضرورت ہے۔ یہ طاقتور ایمان کیسے پیدا ہوگا؟ اس کے لئے اللہ سے اپنے تعلق کو مستحکم کرنا ہوگا اور اپنے دنیادارانہ ماحول کو بدل کر صالح ماحول کا حصہ بننا پڑے گا اور ذکر و فکر کے مجاہدوں سے کام لینا ہوگا، ایسا کرنے سے ہی ایمان کی طاقت پیدا ہوگی اور ہم اللہ کے فضل سے دجالی تہذیب کے ہر شر سے بچنے میں کامیاب ہوں گے، لیکن ہماری عادتیں اور ذہن اتنے مسموم ہو چکے ہیں کہ فتنوں کی شدت، شدید ذہنی انتشار اور مشکلات کا شکار ہونے کے باوجود بدقسمتی سے ہم دنیادارانہ ماحول کو چھوڑ کر صالح ماحول اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ذہنوں کو عادتوں کو صحتمند بنائے بغیر طاقتور فتنوں سے بچاؤ کی کوئی صورت موجود نہیں، دجال کے ظہور تک اگر ہماری حالت یہی رہی تو دجال کا لقمہ تر بننے سے بچنا ہمارے لئے ممکن نہ ہوگا، اس طرح ہم دین و دنیا کے خسران عظیم ہے سے دوچار ہوں گے، اللہ ہمارے دین و ایمان کی حفاظت فرمائے۔

دجال کا فتنہ

ایمان کو سب سے بڑا خطرہ

دجال کا ظہور انسانی تاریخ کا سب سے بڑا خوفناک واقع ہوگا، یہ ظہور کب ہوگا؟ اس کا صحیح علم تو اللہ ہی کو ہے، لیکن احادیث میں اس کی جو علامتیں بتائی گئی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے آثار ظاہر ہوگئے ہیں، اب وہ زیادہ دور نہیں ہے، دجال مکر وفریب کی انتہائی صورت ہوگا، وہ اپنے طلسمات سے بہت سارے افراد کے ایمان کو غارت کرنے کا ذریعہ ہوگا، دجال جس مادی تہذیب کے پھیلاؤ سے اللہ کی منشا سے ظاہر ہوگا، وہ مادی تہذیب اپنے عروج پر ہے، یہ مادی تہذیب بھی لوگوں کے ایمان کو زیر وزبر کرنے کا ذریعہ ہے تو دجال اس سلسلے میں سو گنا زیادہ آگے ہوگا، یہ مادی تہذیب بے پناہ خزانوں کی مالک ہے، جس کے لئے چاہتی ہے، روزگار کشادہ کر دیتی ہے اور جس کے لئے چاہتی ہے، اسے بھوکوں مرنے دیتی ہے۔

یہ مادی تہذیب بھی خدا کے انکار کے فلسفہ پر مبنی ہے تو دجال بھی اپنے رب ہونے کا دعویدار ہوگا، یہ تہذیب بھی اشیائے کائنات کو مطیع کر کے حیرت انگیز چیزوں کے ایجاد کا ذریعہ ہے تو دجال بھی اپنے غیر معمولی طلسمات کی وجہ سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کا موجب ہوگا، بس فرق یہ ہے کہ دجال ان ساری چیزوں میں بہت آگے ہوگا۔

مادی تہذیب دجال کے لئے تیزی سے حالات سازگار بنا رہی ہے، جب لوگ خدا اور مذہب سے دوری کے معاملہ میں انتہا پر ہوں گے تو دجال کا ظہور ہوگا۔

جس دجال سے حضور اکرم ﷺ اور سارے انبیاء کرام نے پناہ مانگی ہو اور جس کا مسلسل انتباہ دیا ہو، اس دجال کے فتنوں سے بچنے کے لئے ایمان ویقین کو مستحکم کرنے کی صورت میں جو تیاری ہونی چاہئے، وہ تیاری نہ ہونے کے برابر ہے، بلکہ ہمارے معاشرے میں

تو سرے سے دجال کا ذکر ہی نہیں ہوتا، جس سے یہ احساس ہو کہ خوفناک قوت ظاہر ہونے والی ہے، جس سے دینی، مذہبی اور اخروی زندگی شدید خطرے سے دوچار ہے۔

ایک حدیث شریف ہے کہ جب مسجد کے ممبروں سے دجال کے فتنہ کے بارے میں آواز بلند نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ دجال قریب ہے۔

ایک حدیث یہ بھی ہے کہ جب دجال ظاہر ہوگا تو گھر کا بڑا اپنی اولاد سے کہے گا کہ باہر نہ جاؤ، باہر دجال آیا ہوا ہے، وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو سختی سے روکنے کی کوشش کرے گا، لیکن وہ اس سے جان چھڑا کر باہر جائیں گے اور اسے دیکھیں گے، اس طرح وہ اس کی یلغار کا شکار ہو جائیں گے اور ایمان کی دولت سے محروم ہو جائیں گے، اسی طرح ایک نیک اور عابد شخص کہے گا کہ میری عبادت کی وجہ سے مجھے دجال کیا کرے گا، اور وہ اس کے پاس جائے گا، وہ اس کے طلسمات کو دیکھکر اس کو رب ماننے پر تیار ہو جائے گا۔

دجال دینی اور اخلاقی اعتبار سے انسانی معاشرے کی پست ترین علامت ہوگا۔

دجال میں شر کی جو خوفناک علامتیں ہوں گی، ان کو کچھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے

•وہ لوگوں کو اپنے رب ہونے کی دعوت دے گا اور اس کی آواز دنیا کے سارے انسانوں تک پہنچے گی •وہ دنیا کے ایک ایک شہر اور گاؤں تک پہنچے گا، •وہ مکر وفریب اور طلسمانی چیزوں کے مظاہرے سے بہت سارے لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوگا •رزق کے خزانے اس کے پاس ہوں گے، جو اس کو مانے گا اس کے لئے رزق کے خزانے کھول دے گا، جو انکار کرے گا اس کی روزی کو مشکل بنا دے گا •وہ اپنے نہ ماننے والے بعض افراد کو قتل کرے گا، پھر ان کو زندہ بھی کرے گا •اس کی کشش لوگوں کو اُس کے قریب کرنے پر مجبور کرے گی •وہ جب ظاہر ہوگا تو اس کے ساتھ ستر ہزار یہودیوں کا لشکر ہوگا، جو مسلمانوں کے خلاف لڑائی میں اس

کے ساتھ ہوگا • اس کے ظہور سے چند دن ہی پہلے اہل یورپ کالاکھوں کا لشکر شام میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کررہا ہوگا • اس کے ظہور تک مادی تہذیب ایسے ایسے آلات ایجاد کرچکی ہوگی جس سے دجال کی طاقت میں مزید اضافہ ہوگا • دجال دنیا میں چالیس دن رہے گا، اس کا پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا، یہ چالیس دن مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش کے دن ہوں گے • دجال سے مقابلے کے لئے طاقتور صاحب ایمان افراد نہایت پُرعزم وپُرحوصلہ ہوں گے، وہ شام میں دجال سے مقابلے کی تیاری کررہے ہوں گے اور نماز شروع کرنے والے ہوں گے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرشتوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھکر اتریں گے اور نماز ادا کرنے کے بعد دجال سے صف آرا ہوں گے اور وہ دجال کو اسرائیل کے ایئرپورٹ لد کے مقام پر پکڑیں گے اور اسے قتل کریں گے • عالمی ساہوکار جو زیادہ تر اہل یہود پر مشتمل ہیں، وہ دجال کی پشت پر ہوگا • مسلمان ملکوں پر مغرب کی جو سیاسی، معاشی، فکری، نظریاتی اور علمی بالادستی اب قائم ہے، دجال کے دور میں اس بالادستی میں کئی گنا زیادہ اضافہ ہوجائے گا اور مسلمان حکمران دجال سے شدید خوف زدہ ہوں گے اور ان کی دی ہوئی پالیسیوں کو اپنے ملکوں میں رائج کرنے کے لئے تیار ہوں گے، • دجال یہودیوں میں ہو یا نہ ہو، لیکن یہودی اسے اپنا نجات دہندہ سمجھکر اس کے پیروکار بن جائیں گے • دجال دائیں آنکھ سے کانا ہوگا جب کہ اس کی بائیں آنکھ بہت بہتر طور پر کام کرے گی، اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ ایمان ویقین اور روحانیت سے آخری حد تک محروم ہوگا، اس سلسلے میں وہ دل کا اندھا ہوگا، جب کہ دنیا پرستی، اور اپنے مفادات کو سمجھنے کے معاملے میں تیز تر ہوگا، اور پوری دنیا کو اس طرف گامزن کرنے کی راہ پر چلے گا • وہ زمین کو حکم دے گا تو زمین خزانے اگل دے گی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اسے تھوڑی دیر کے لئے جو اختیار دیا ہوگا تو وہ اس اختیار کو پوری طرح استعمال کرکے

اپنے رب ہونے کی دعوت کے ساتھ ساتھ مادہ پرستی کو فروغ دینے کے لئے بھی کوشاں ہوگا، مادہ پرستی جو اس وقت بالخصوص اہل مغرب کا مقصود ہے اور ان کے لئے سب سے زیادہ محبوب تر چیز ہے، دجال ان کے جذبات کی تسکین کا سامان بھی فراہم کرے گا، اس طرح وہ ان کو بھی پوری طرح اپنا ہمنوا بنالے گا • دجال کی شخصیت میں شر کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہوگا کہ موبائل وغیرہ کے ذریعہ اس کی تصویر کو دیکھنا بھی خطرات سے خالی نہ ہوگا • مسلمانوں کی جو نسلیں فرنگی تعلیم کے زیر اثر پروان چڑھی ہیں، دجال ان کے لئے زیادہ خطرہ کا باعث ہوگا، اس لئے کہ وہ ذہنی اعتبار سے پہلے ہی فرنگی تہذیب سے متاثر ومرعوب ہے، دجال کو ان کو قابو کرنا آسان ہوگا • دجال اگرچہ دنیا میں چالیس دن رہے گا، لیکن اس کی فتنہ پردازی کی صلاحیت کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے یہ چالیس دن قیامت خیز ہوں گے، ایمان کی مضبوطی اور اللہ سے مستحکم تعلق کے بغیر دجال کے فتنوں سے بچنا ممکن نہ ہوگا، ایمان اور ذکر کا نور ہی دجال کے فتنے سے بچاؤ کا ذریعہ بن سکتا ہے، احادیث میں سورۃ کہف یا اس کی ابتدائی دس آیتوں کو معمول بنانے کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ اس سے بھی دجال کے فتنہ سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوگی • اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے مومنوں کو یہ خوش خبری سنائی ہے کہ جب رزق اور روزی کے سارے وسائل دجال کے ہاتھوں میں چلے جائیں گے تو مومنوں کے لئے اس وقت اللہ کی تسبیح وتحمید ہی کافی ہوگی، اس سے ان کی غذا کی ضرورت پوری ہوگی۔

• عالم اسلام کے حکمران جو اپنے آپ کو بڑا مستحکم سمجھتے ہیں، وہ دجال کا سب سے زیادہ لقمہ تر ہوں گے، اس لئے کہ وہ ہر وقت اقتدار کے نشے اور اس کے خبط میں رہتے ہیں، اقتدار کا نشہ انہیں ایمان پر محنت کی طرف آنے ہی نہیں دیتا • دجال کے ظہور سے اسلام اور کفر کے درمیاں کشمکش تیز سے تیز تر ہوجائے گی، یہ کشمکش اگرچہ اب بھی جاری ہے، بلکہ پچھلے

دو ڈھائی سو سال سے مسلمان دجالی تہذیب کے علمبرداروں سے صف آرا ہیں، لیکن دجال کو قدرت کی طرف سے وقتی طور پر جو قوتیں دی جائیں گی، اس کی وجہ سے اہل ایمان سے دجال کی معرکہ آرائی نہایت سخت ہو گی، لیکن صلاحیتیں امتحان اور آزمائش کے وقت ہی اجاگر ہوتی ہیں، پھر اہل ایمان کے ساتھ اللہ کی مدد بھی شامل ہو گی، یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس مشکل ترین وقت میں مسلمانوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔

یہ تشویشناک بات ہے کہ دجال کا ظہور قریب سے قریب تر ہو رہا ہے، لیکن ہماری اس سے غفلت اور اس سے بے نیازی کی حالت افسوسناک ہے، فتنہ جتنا زیادہ سخت ہوتا ہے، اس سے بچاؤ کے لئے فکر مندی اتنی زیادہ ہوتی ہے، ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اس کی فکر مندی کریں، لوگوں کو اس کی یاد دہانی کرائیں اور معاشرے میں ایمان و یقین کی فضا بنانے کے لئے جتنی بھی کاوش ہو سکتی ہے، کریں۔

خیالی قوت کی حفاظت سے
پاکیزہ زندگی کا حاصل ہونا

الم یعلم بان اللہ یریٰ۔ (کیا انسان نہیں جانتا کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے)۔

خیالی قوت کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر وقت کام کرتی ہے، نفس خیالی قوت کو یرغمال بنا کر اپنی خواہشات کی تکمیل اور دنیاداری کے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، نفس اور شیطانی قوت کو شکست دینے کے لئے خیالی قوت اور ذہن کو اللہ کی ذات اور اس کی ہستی میں مصروف رکھنا انتہائی ضروری ہے، اس آیت سے بالواسطہ طور پر اللہ کے مراقبہ کا بھی اثبات ہے۔

موجودہ دور میں خیالی قوت اور ذہن کے بگڑنے کے امکانات و خطرات پہلے کے مقابلے میں کئی سو گنا زیادہ بڑھ گئے ہیں، خیالی قوت کے منتشر ہونے سے نہ صرف فکری انتشار پیدا ہوتا ہے، بلکہ عمل میں بھی سستی واقع ہونے لگتی ہے، اگر دھیاں زیادہ دیر تک اللہ سے دور رہا تو شخصیت رفتہ رفتہ بے عملی بلکہ بد عملی کا شکار ہونے لگتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خیالی قوت کو کنٹرول کرنے اور اسے پاکیزہ بنانے کی سب سے بہتر صورت اللہ کے اسم ذات پر محنت کر کے، اسے اپنی شخصیت کا حصہ بنانا ہے، فرد کی یہ خاصیت بد ہے کہ وہ اللہ سے جو وقت بھی دور ہوتا ہے، اس کا وہ وقت منفی خیالات میں گزرنے لگتا ہے۔

اللہ کی طرف سے بندہ مؤمن کو اپنے اسم ذات کا ایسا عظیم نسخہ عطا فرمایا گیا ہے، جو خیر کا سرچشمہ ہے اور بُرائیوں کو منہدم کرنے کا ذریعہ بھی۔ اللہ کی ذات میں حسن بھی ہے، توانائی بھی ہے، ساری اعلیٰ صفات اس ذات سے وابستہ ہیں، اس لئے اللہ کے اسم ذات پر محنت سے بندہ مومن کی شخصیت میں حسن اور توانائی کے ایسے اجزاء آجاتے ہیں، جس سے اس کا دل

حلاوت سے سرشار ہو جاتا ہے، اور شخصیت میں ایسی توانائی آجاتی ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات میں نفس اور شیطانی قوت سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، نیز وہ اخلاق حسنہ کا حامل بھی ہونے لگتا ہے۔

آج کل فکری انتشار اور ذہنی دباؤ کی وباعام ہے اور ہر شخص رونا روتا ہے کہ ہمارے حالات ایسے خراب ہیں کہ طبیعت سخت مضمحل رہنے لگتی ہے اور خطرات گھیرے رہتے ہیں، اللہ کے اسم ذات کے انوار کی موجودگی میں بندہ مؤمن کے یہ حالات ایسے ہیں، جو اسے جھنجھوڑ کر اللہ کے دھیان کو غالب کرنے کی طرف لے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں جو شخص بھی اللہ کے ذکر سے دور رہے گا اور اس پر محنت نہیں کرے گا، اسے مسائل گھیر لیں گے اور ان مسائل کے زیر اثر اس کی زندگی وبال بن کر رہ جائے گی، بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ اس دور میں ذکر سے غافل افراد کی حالت وہ ہو جائے گی، جو نیم پاگل افراد کی ہو جاتی ہے۔

اللہ کے انوارِ ذکر اور انوار حسن سے یہ ہوتا ہے کہ فرد ہر طرح کے حالات میں مستحکم اور مطمئن ہوتا ہے اور خراب سے خراب حالات بھی اسے اپنی جگہ سے ہلانے میں ناکام رہتے ہیں، ایسے افراد ہی ہیں، جن سے معاشرہ قائم رہتا ہے۔

خیالی قوت کی عدم حفاظت سے جو نقصانات ہوتے ہیں، ان میں سے کچھ نقصانات یہ ہیں۔

• اسلامی شریعت پر پوری طرح چلنا دشوار ہو جاتا ہے • اخلاق حسنہ پیدا نہیں ہو پاتے، • غصہ، جھنجھلاہٹ اور عدم برداشت کا مزاج پیدا ہونے لگتا ہے • اعمال میں سستی واقع ہونے لگتی ہے • زبان پر کنٹرول نہیں ہو پاتا • دنیا کا رعب غالب ہونے لگتا ہے • دوسروں سے بدظنی پیدا ہونے لگتی ہے • ذہنی انتشار پیدا ہونے لگتا ہے • حالات خراب ہوتے ہیں تو فرد کا ذہنی

توازن متاثر ہونے لگتا ہے • اللہ سے تعلق کمزور ہونے لگتا ہے • بندوں سے تعلقات میں کشیدگی یا سرد مہری پیدا ہونے لگتی ہے • نفسا نفسی کی حالت غالب ہونے لگتے ہے۔

کتنے بڑے نقصانات ہیں، جو اللہ کے دھیاں سے دوری کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ جن افراد کی خیالی قوت مستحکم ہوتی ہے، ایسے افراد کی صحبت اور ان سے رابطے سے منتشر خیالی قوت کے حامل افراد کی بھی خیالی قوت رفتہ رفتہ بہتر ہونا شروع ہو جاتی ہے اور اللہ کے ذکر کے انوار کو قبول کرنے کی ان کی استعداد میں اضافہ ہونے لگتا ہے، منتشر خیالی قوت کے حامل افراد اپنے طور پر کوشش کریں گے تو انہیں ذہن کو پاکیزہ مرکزی نکتے پر لانے میں سخت دشواری درپیش ہوگی، اس لئے ایسے افراد کی صحبت ضروری ہے، جو مجاہدوں سے اپنی خیالی قوت کو مستحکم اور پاکیزہ بنانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں، ویسے بھی سیکھنے سکھانے کے عمل کے لئے فرد کا طالب بن کر استاد کا دامن پکڑنا ضروری ہوتا ہے، اس کے بغیر سیکھنے سکھانے کا عمل ہوتا نہیں ہے۔

قرآن کی مذکورہ آیت یاد دہانی کے لئے دوبارہ پیش کرتے ہیں، **الم یعلم بان اللہ یریٰ** (کیا انسان نہیں جانتا کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے) اس کے جواب میں ہمیں کہنا چاہئے کہ یقیناً اللہ دیکھ رہا ہے اور ہمیں اللہ کے دیکھنے کے احساس کو غالب سے غالب تر کرنے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں نفس اور شیطان کی ہر طرح کی کوششوں کو ناکام بنانا چاہئے، ہمیں کوشاں ہونا چاہئے کہ دنیا میں ہمیں یہ سعادت اور نعمت عظمیٰ حاصل ہو، تاکہ ہم سعادت دارین سے بہرہ ور ہو سکیں، ورنہ ہمارے لئے دنیا و آخرت میں اللہ کے جلالی صفات سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے، بہت مشکل ہے۔

اس بات کا ادراک ہونا بھی ضروری ہے کہ خیالی قوت محض خیالی قوت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ساتھ دل کی قوت بھی شامل ہوتی ہے، یہی نہیں، بلکہ پوری انسانی شخصیت خیالی قوت ہی کے تابع ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں خیالی قوت ہوگی، وہاں دل اور انسانی

شخصیت بھی موجود ہو گی، خیالی قوت پر اگر خواہشات کا غلبہ ہو گا تو انسانی شخصیت خواہشات کی اسیر بن جائے گی، لیکن اگر خیالی قوت پر خیر اور نیکی کا غلبہ ہو گا تو دل اور پوری انسانی شخصیت خیر کے تابع ہو گی۔

اس سے دھیان کے غلبے اور خیالی قوت کے طاقتور ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، لیکن خیالی قوت کو کنٹرول کرنا سب سے مشکل ترین کام ہے۔

اس کے لئے جان توڑ مجاہدوں کی ضرورت ہے، مجاہدوں کے بغیر چارہ کار ہی نہیں۔

ذہن اور دل کے درمیان نازک نوعیت کا تعلق ہے، خیالی قوت اگر منفی رخ اختیار کرتی ہے تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر دل کی حالت بگڑنے لگتی ہے، اس پر بھی ذہن کے مسموم اثرات پڑنے لگتے ہیں، لیکن اگر دل خیر کی طرف راغب ہونا چاہتا ہے تو ذہن کا دل سے گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے ذہن بھی خیالی قوت کو مثبت سمت میں لانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اس لئے اللہ کے اسم ذات کے ذکر میں دل اور ذہن دونوں کو مرکزی نکتہ پر لانا پڑتا ہے، یعنی دل اللہ اللہ کرے، ذہن، دل کے اللہ اللہ کرنے کو محسوس کرتا رہے، ایسا کرنے سے ہی شخصیت اللہ اور اس کے رسول کے تابع ہونے لگتی ہے۔

کردار کی روشنی

کردار کی روشنی ایسی چیز ہے جو انسانیت کا سرمایہ ہے، دین و مذہب کی بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ فرد و افراد کو انسانیت سے بہرہ ور کر کے کردار کا صاحب بناتا ہے، جب کہ دین سے بے بہرہ ور عقلیت پر مبنی نظریات افراد کو مفادات اور دنیاداری کا اسیر بنا کر، حقیقی کردار سے محروم کر دیتے ہیں، ان کے ہاں کسی حد تک کاروباری اخلاق تو موجود ہوتا ہے، لیکن کردار کی حقیقی روشنی سے محرومی ہوتی ہے، کردار کی روشنی دین و مذہب ہی کا حصہ ہوتی ہے، کردار کی روشنی فرد کو اللہ سے قریب بھی کر دیتی ہے تو اللہ کے بندوں سے بھی۔

کردار کی روشنی تو بے غرضی، بے نفسی اور للہیت سے پیدا ہوتی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اخلاق حسنہ کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں، آپ نے فرمایا قیامت کے دن ترازو میں سب سے بھاری چیز اخلاق ہوں گے۔

اگر دین سے وابستہ افراد میں کردار کی روشنی کا فقدان ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ دین کی روح تک رسائی میں ناکامی ہے اور دین کے لئے مجاہدوں کا فقدان ہے۔

کردار محض رسمی دینداری سے پیدا نہیں ہوتا، اس کے لئے نفس کی قوت کو پامال کر کے اللہ سے تعلق کو مستحکم کرنا پڑتا ہے، حدیث شریف ہے تخلقوا باخلاق اللہ، اللہ کے اخلاق اختیار کرو۔ کردار کی روشنی ایسی چیز ہے جو دعوت کا کام بھی کرتی ہے کہ ایسے فرد کے کردار سے لوگ اس کے قریب سے قریب تر ہوتے ہیں اور اس کی روشنیٔ کردار سے اخذ کر کے اپنی زندگی کو اس سے ہمہ آہنگ بنانے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔

کردار کی روشنی سے محرومی کا دوسرا مطلب بداخلاقی ہے، جو انسانیت کے شان کے بالکل منافی ہے اور دین و مذہب کی تعلیمات کے بھی منافی ہے۔

جب تک کردار کی روشنی پیدا نہیں ہوتی، تب تک فرد نہ تو دعوت کے کام کے اہل ہو سکتا ہے، نہ ہی معاشرے کے لئے کار گر ثابت ہو سکتا ہے، آج کل دین کے نام پر غلبہ دین اور سیاسی تبدیلی کے کاموں کو ہدف بنایا گیا ہے، اور ذہن نے اسی فکر کا احاطہ کر لیا گیا ہے، لیکن کردار کی روشنی پیدا کرنے کے کام کو کام ہی نہیں سمجھا جارہا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ غلبہ دین اور سیاسی تبدیلی کی باتیں تو ہوتی ہیں، لیکن اس کام میں کوئی پیش رفت نہیں ہوتی، یہ سب نتیجہ ہے دین کی حقیقی ترتیب کو نہ سمجھنے کا، دین تو سب سے پہلے افراد کی زندگیوں کو تبدیل کر کے اسلام سے ہمہ آہنگ بنانا چاہتا ہے، افراد کی زندگیوں کو تبدیل کرنا اور سیرت و کردار کا حامل بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ وعظ و نصیحت، مطالعہ اور ضابطے قائم کرنے سے ایسا ہو جائے، انسان سب سے پیچیدہ مخلوق ہے، اسے صحیح معنٰی میں انسان بنا کر کردار کا حامل بنانا، غیر معمولی مجاہدوں کا متقاضی ہے کہ اس سے نفس کی قوت کو پامال کر کے اسے مہذب بنایا جائے۔

اسلام کردار ہی سے پھیلا ہے، بے کردار افراد جو باتوں کے ذریعہ اسلام کو پھیلانا چاہتے ہیں، ان بیچاروں کے لئے دینی اعتبار سے اپنے آپ کو سنبھالنا ہی کار دار دہے۔

زندگی میں موجود غیر معمولی خلا

اس کو سمجھنے اور پُر کرنے کی صورت

ہماری زندگیوں میں عام طور پر سکوں سے محرومی کی حالت غالب ہے، ہم ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے اور شہرت کے متمنی رہتے ہیں، ہمارا دل دنیا اور دولت میں اٹکا ہوا ہے، ہم دوسروں کا اکرام کرنے کی سعادت سے بھی محروم ہیں، اس طرح کی بہت ساری چیزیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ ہماری زندگیوں میں کوئی بہت بڑا خلا موجود ہے، اس خلا کی وجہ سے سکوں کے ظاہری سامان ہونے کے باوجود ہماری زندگیاں زہر سے عبارت ہو گئی ہیں، یہ خلا ایسا ہے جس کی بنا پر ہم سلیقہ انسانیت سے بے بہرہ ور ہوتے ہیں اور انسانیت کے کام آنے سے قاصر بھی۔ یہ خلا ہمیں خود اعتمادی سے محروم رکھنے کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

جب زندگی میں یہ خلا پیدا ہو جاتا ہے تو زندگی بے معنٰی محسوس ہونے لگتی ہے کیا ہم نے اس خلا کی نوعیت کو سمجھنے کی ضرورت محسوس کی ہے؟ بہت کم، سبب یہ ہے کہ اس خلا نے ہماری عقلی صلاحیتوں کو بھی بُری طرح متاثر کیا ہے۔

جب قدرت کی طرف سے کسی کو سزا دی جاتی ہے تو وہ یہی سزا ہوتی ہے کہ اسے خود سے بھلا دیا جاتا ہے۔

اقبال نے اس سلسلے میں خودی کی اصطلاح استعمال کی ہے، خدا کی طرف سے انسان کو خودی کی صورت میں ایسا جوہر عطا کیا گیا ہے جو خدا کے مشاہدے سے تسکین پاتا ہے، اس دنیا میں خودی کو خدا کا مشاہدہ جزوی طور پر ہی حاصل ہوتا ہے، لیکن اس جزوی مشاہدے سے بھی اس کے سارے جذبات حسن کی تسکین ہونے لگتی ہے اور اس کی ویرانی کی حالت مکمل طور پر دور ہونے لگتی ہے۔

اقبال نے اپنے فلسفہ خودی کی جو اصطلاح استعمال کی ہے، اس کا مفہوم خود شناسی وخدا شناسی ہے، خود شناسی ذکر وفکر کے ذریعے اندر میں ڈوبتے رہنے سے حاصل ہوتی ہے، فرد جب اندر میں ڈوبتے رہنے کے عمل کو مسلسل دہراتا رہتا ہے تو ایک تو اس کی اپنے نفس کی قوتوں سے پوری طرح آشنائی ہونے لگتی ہے اور اس پر فتحیابی بھی حاصل ہوتی ہے (لیکن یہ فتحیابی ایک مستقل عمل سے ہی حاصل ہوتی ہے) دوسرے یہ کہ اسے روح کی محبوب حقیقی کے لئے غیر معمولی بے تابی کا مشاہدہ ہوتا ہے، اس طریقے سے خود شناسی کے ذریعہ خداشناسی حاصل ہونے لگتی ہے، یہ بندہ مومن کا معاملہ ہوتا ہے، جو صاحب ایمان ہوتا ہے۔

خود شناسی کے بغیر باطن میں موجود غیر معمولی باطل قوتوں کا ادراک حاصل ہو کر ان پر فتحیابی حاصل محال ہوناتر ہے۔

خودی یعنی خود شناسی اور خداشناسی کے لئے بندہ مومن کو نفس کی قوتوں سے شدید معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے، اس کے بغیر نہ تو خودی کے جذباتِ حسن کی تسکین ہو سکتی ہے اور نہ ہی انسانی شخصیت میں فساد برپا کرنے کی قوتوں کا ادراک ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ خود شناسی اور خداشناسی اسلام کی روح ہے، جب یہ حاصل ہوتی ہے تو اس سے جہاں روح کی بے تابی دور ہوتی ہے، وہاں اسلامی تعلیمات پر احسن طریقے سے عمل پیرا ہونے کی استعداد بھی حاصل ہوتی ہے، اس لئے کہ اس سے روحانی قوت، نفس کی قوتوں پر غالب آجاتی ہے، اور اللہ کی اطاعت کی راہ پر نفس کی قوتوں کی طرف سے ہونے والی مزاحمت بڑی حد تک کمزور ہو جاتی ہے۔

موجودہ دور میں لگ بھگ ہر شخص کی زندگی میں جو غیر معمولی خلا پایا جاتا ہے، وہ دراصل خودی کے جذبات حسن کی تسکین نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے، اگر یہ خلا دیندار لوگوں میں بھی موجود ہو تو سمجھا جائے گا کہ گہری عبادت، اور ذکر وفکر کے ذریعہ نفس کی قوتوں کو مفتوح کر کے اس پر روحانی قوت کو غالب کرنے کے کام سے غفلت سرزد ہوئی ہے، ورنہ خود شناسی

اور خداشناسی کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات پر اخلاص کے ساتھ عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے باطن میں موجود خلا کے خاتمے کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے۔

یہ ہمارا المیہ ہے کہ عقلیت پرستی کے غلبے کی وجہ سے موجودہ دور میں خودی کے اس تقاضے کا شعور وادراک ہی سلب ہو گیا ہے، چونکہ تعلیم میں نہ تو خودی کی روح کو شامل کیا گیا ہے اور نہ ہی خودی کا بھول سے بھی ذکر کیا جاتا ہے۔

اس کی وجہ سے خودی سے دوری کی ہمہ جہتی اور ہمہ گیر حالت پیدا ہو گئی ہے، چنانچہ پوری انسانیت سراپا اضطراب اور بے قراری سے عبارت ہو گئی ہے، خودی کا ذکر اگر کہیں ہوتا ہے تو وہ اہل اللہ کے ہاں ہوتا بھی ہے تو ساتھ ساتھ اس کے جذبات حسن کے تسکین کی عملی صورت بھی پیدا ہوتی ہے۔

ضد اور اکڑ فوں کی نفسیات

اور اس کے نقصانات

مذہب کے اثرات کمزور ہو جانے سے جو اخلاقی بیماریاں پیدا ہوئی ہیں، ان میں ایک ضد کی نفسیات بھی ہے، ضد کی نفسیات اکثر تکبر اور اکڑ فون کا نتیجہ ہوتی ہے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ فرد حق اور سچ بات قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، ایسا فرد اگر آفسر ہے یا کسی ادارہ اور کمپنی کا مالک ہے تو وہ اپنے ماتحتوں کے لئے ضد اور اکڑ فوں کی وجہ سے عذاب بن جاتا ہے، ان پر ڈانٹ ڈپٹ اور ان کی تذلیل کرنا، اس کا آئے دن کا مشغلہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے ماتحت افراد سخت ذہنی دباؤ کا شکار رہتے ہیں، ضد کی نفسیات کا حامل فرد دوسروں کے لئے ابتلا و آزمائش کا موجب تو بن ہی جاتا ہے، لیکن وہ خود بھی نفسیاتی طور پر سخت ہیجانی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے، اس کا ذہن اور مزاج سخت غیر متوازن ہو جاتا ہے، نیز اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔

معاشرے میں جوں جوں مادہ پرستی کے رجحانات بڑھتے جارہے ہیں، اسی حساب سے ضد جیسی بیماریوں میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے، جس سے افرادِ معاشرہ کا سکون غارت ہوتا جارہا ہے۔

ضد کی نفسیات کے حامل آفیسر، عہدیدار اور ادارے یا کمپنی کے مالکان کا یہ رویہ ایسا ہے، کہ اس کے خلاف اس کے ماتحتوں کی آہیں نکلتی ہیں، وہ ان کے خلاف عملاً تو کچھ بھی نہیں کر سکتے، سوائے بد دعاؤں کے، ان بد دعاؤں کے اثرات کی وجہ سے وہ خود اور اس کا گھرانہ آئے دن نئے نئے حادثوں، آفتوں اور بیماریوں کا شکار ہونے لگتا ہے، اس سب کے باوجود وہ

اپنی نفسیات کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، قدرت اسے ان حادثوں کی وجہ سے سوچنے سمجھنے کا موقعہ فراہم کرتی ہے، لیکن وہ اکڑ فوں کے اُس مقام پر پہنچ چکا ہوتا ہے، جہاں سلیقہ انسانیت کے مقام پر واپس آنا اس کے لئے محال تر ہے۔

معاشرے میں ہمیں جو فساد نظر آرہا ہے، وہ دراصل اسی قسم کے افراد کا برپا کردہ ہے، وہ چونکہ اصلاح سے بے نیاز ہوتے ہیں، اس لئے ان پر نہ صرف یہ کہ نصیحت کی کوئی بات اثر انداز نہیں ہوتی، بلکہ اس سے ان کی ضد کی حالت میں مزید اضافہ ہونے لگتا ہے، وہ طیش میں آکر اپنے ماتحتوں کو ذلیل کرنے لگتے ہیں۔

یہ المناک صورتحال ہے جو بد قسمتی سے ہمارے معاشرے میں پیدا ہو چکی ہے، پہلے ہمارے معاشرے میں دوسروں کی تکریم، کام کرنے والوں کی عزت، مروت، رواداری اور وسعت ظرفی کی جو فضا موجود تھی، بد قسمتی سے وہ تیزی سے ختم ہوتی جارہی ہے۔

ایسے افراد ضمیر کی آواز پہلے ہی بند کر چکے ہیں، ماتحتوں کی بات وہ سنتے نہیں بس وہ قدرت کے کوڑے کے منتظر ہوتے ہیں، جب وہ کوڑہ برستا ہے تو فرار اور بچاؤ کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں، ایسے متعدد افراد دیکھے گئے ہیں، جن کی حالتِ زار دیکھکر دکھ ہوتا ہے۔

یہ حالت ایسی ہے کہ جو اکڑ فون کا حامل آفسر یا عہدیدار سمجھتا ہے کہ میری بات میرا حکم ہے، میرا حکم قانون ہے، جس کی پابندی ہر صورت میں ناگزیر ہے دوسری صورت میں ماتحت فرد سزا کا مستحق ہوگا۔

بظاہر تو یہ روش معمولی لگتی ہے، لیکن یہ دراصل اپنے آپ کو خداوندی کے دائرے میں شامل کرنے کے مترادف ہے، ایسے فرد کو دنیا میں فوری طور پر نہ سہی، لیکن آخر کار سزا مل کر رہتی ہے اور آخرت میں جو سزا ملے گی تو وہ ظاہر ہے عبرتناک سزا ہوگی، ضد اور اکڑ فون کی

نفسیات مزاج کی خرابی کی وجہ سے ہو یا غلط عادتوں کا نتیجہ، یا پھر آفسری اور عہدے کی رعونت کے سبب ہو، ہر صورت میں اس خرابی کا نتیجہ معاشرے میں فساد برپا کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مزاج کی یہ خرابی متعلقہ فرد پر قدرت کی طرف سے سزا کی صورت ہی ہوتا ہے۔

بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ آفسروں اور عہدیداروں کی کافی تعداد اس کڑفون اور رعونت کا شکار ہے۔

ضد کی یہ نفسیات ایسی ہے جو متعلقہ فرد کو ذہنی اور طبعی طور پر شدید غیر متوازن بنا دیتی ہے، اس سے اس کی شخصیت خود مسائل کا شکار ہو جاتی ہے، اس مزاج کی وجہ سے وہ اپنے ماتحت عملے کو شدید ذہنی اذیت کی حالت میں رکھتا ہے، اس طرح وہ ان سب کی آہوں کا شکار ہونے لگتا ہے۔

اکڑفون کا عمل در اصل شیطانی عمل ہے، شیطان نے حضرت آدم کو اپنے سے کم تر سمجھنے کی وجہ سے سجدہ نہیں کیا، اس نے سجدہ کو اپنی بے عزتی سمجھا کہ وہ مٹی سے پیدا شدہ فرد کو کیونکر سجدہ کرے، اس اکڑفوں کی وجہ سے وہ ملعون ہوا اور بے شمار انسانوں کی ملعونیت کا ذریعہ بنا اور بن رہا ہے، تکبر اور اکڑفوں کے مزاج کی وجہ سے اپنے ماتحتوں کی تذلیل و تحقیر کرنا اور انہیں ذہنی اذیت شکار بنانا، اپنے آپ کو شیطانی عمل کا حصیدار بنانا ہے۔

فرد اسے اپنی عزت اور بے عزتی کا مسئلہ بھی بنا دیتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عزت کی مستحق تو اللہ کی ذات ہی ہے، انسان کو تو حقیر بن کر رہنے کا سلیقہ سیکھنا چاہئے کہ عبدیت کا تقاضا یہی ہے، دوسری صورت میں خدائی صفات میں شرکت کا جرم سنگین ہے، جس کی سزا بھی سنگیں ہے، تکبر صرف اور صرف اللہ کی صفت ہے، اور اللہ کے شایان شان ہی ہے۔

ضد کی نفسیات جہاں بھی موجود ہوگی وہاں تکبر اور اکڑفوں کی بیماری کارفرما ہوگی، فرد چاہے کتنے ہی عذر و بہانے بنائے کہ یہ تکبر نہیں ہے لیکن یہ تکبر ہی میں شمار ہوگا، فرد اگر اندر میں غوطہ زنی کرتا رہے تو ضمیر کی قوت اسے بتائے گی کہ تکبر سے باز آجاؤ، اسی میں تمہارا بھلا ہے۔

واضح ہو کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے ضد کی حالت پیدا ہو جائے اور جلد ہی فرد سنبھل جائے تو یہ حالت اکڑفوں میں شمار نہیں ہوگی تکبر اور اکڑفوں میں ضد کی نفسیات شمار ہوگی، جس میں فرد اپنے ماتحتوں کی تحقیر و تذلیل کو اپنے مزاج کا حصہ بنالے، اور یہ حالت اس کا معمول بن جائے۔

بندوں کے حقوق غصب کرنے کی روش

اسلام نے بندوں کے حقوق (حقوق العباد) کو بڑی اہمیت دی ہے، مسلمان اپنے بھائی کے حقوق غصب کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، اس لئے کہ اللہ اپنے حقوق تو جس کے چاہے معاف کر لیتا ہے، سوائے شرک کے، لیکن بندوں کے حقوق غصب کرنے کی معافی بندوں کی معافی پر منحصر ہے۔

اس دور میں قساوت قلبی اور دنیا پر ٹوٹ پڑنے کی روش کی وجہ سے بندوں کے حقوق غصب کرنے میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے، بالخصوص دھوکہ دہی سے دوسروں کا مال ہضم کرنے کے واقعات بہت زیادہ ہو گئے ہیں، جس سے ہمارے معاشرہ کی دینی اور اخلاقی زبوں حالی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مال ایسی چیز ہے جو آسانی سے حاصل نہیں ہوتا، اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے، خون پسینہ بہانا پڑتا ہے، اس طرح کے مال کو غصب کرنا دیدہ دلیری بھی ہے تو ساتھ ساتھ آخرت کے عذاب سے بے خوفی کی علامت بھی۔

یہاں اس سلسلے میں کچھ واقعات پیش کئے جاتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارا معاشرہ کہاں جا رہا ہے، یہ وہ واقعات ہیں جو میرے ساتھیوں اور عزیزوں سے پیش آئے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے واقعات بھی ہیں، جنہیں پیش کرنے کا مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔

ہمارے ایک ساتھی جو آنکھوں سے معذور ہیں، ان کو ایک صاحب نے کہا کہ میں کاروبار شروع کر رہا ہوں، آپ اگر اس میں شرکت کریں تو منافع کی بہت زیادہ توقع ہے، اس کے اکسانے پر ہمارے ساتھی نے اس کو چالیس لاکھ روپے دیئے، جو اس کے پاس کل سرمایہ تھا، ان صاحب نے شروع میں تو ان کو ماہانہ بنیادوں پر منافع کی کچھ رقم دی، لیکن بعد میں منافع کی رقم بھی بند کر دی، ساتھ ساتھ پیسے واپس کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

معلوم ہوا کہ ان صاحب نے دھوکہ سے بیسوں افراد کے پیسے ہضم کر لئے ہیں، پولیس میں رپورٹ داخل کرائی گئی، لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔

ہمارے ایک عزیز نے جن کے پاس تھوڑی سرزمین ہے، انہوں نے اس زمین سے پیسے بچا کر جمع کئے، ایک صاحب نے ان سے کہا کہ مجھے بھینوں کے کاروبار کا تجربہ ہے، آپ اگر پیسے دیں تو انشاء اللہ کافی منافع حاصل ہوگا، انہوں نے ان کو لاکھوں روپے دیئے، شروع میں تو ان صاحب نے ان کو منافع دیا اور کہا کہ مزید پیسہ دیں تاکہ کاروبار میں وسعت ہو، اس نے ان کو ستر لاکھ روپے دیئے، اب ان صاحب نے منافع بھی بند کر دیا تو ساتھ ساتھ پیسے بھی کھا لئے۔

ہمارے ایک اور ساتھی ہیں، انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو جن کو گاڑیاں خرید کرنے کا تجربہ تھا، اپنے دوست اور اپنے لئے گاڑی خریدنے کے لئے چالیس لاکھ سے زیادہ رقم دی، لیکن نہ تو اسے گاڑیاں ملی اور نہ ہی پیسے واپس ہوئے۔

ایک صاحب کو ان کے دوست نے فون کیا کہ میں کویت آیا ہوا ہوں، میرے گھر والوں کو پیسوں کی ضرورت ہے، تم ان کو بیس لاکھ دیدو، میں جلد ہی واپس آرہا ہوں، آپ کو پیسے دیدوں گا، ان صاحب نے ان کے گھر والوں کو بیس لاکھ روپے دیدیئے، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صاحب کویت نہیں گئے تھے، یہیں تھے، ان سے پیسے لوٹنے کے لئے انہوں نے کویت کا نام لیا۔

اسی طرح ایک صاحب جو بہت غریب ہیں، شکل وصورت سے ان کی غربت ظاہر ہوتی ہے، انہوں نے بتایا کہ میرے دو ساتھیوں نے میرے دس لاکھ روپے غصب کئے ہیں، میرے پاس کل رقم ہی یہی تھی، بچوں کی تعلیم اور گزارہ کے لئے بھی میرے پاس نہیں ہیں۔

ہمارے ایک ساتھی کے ایک صاحب نے چالیس لاکھ روپے ہضم کر لئے، ہمارے ساتھی کورٹ میں گئے، کورٹ میں برسوں تک مقدمہ چلتا رہا، عدالت نے پیسے واپس کرنے کا

فیصلہ دیا، اس پر ہمارے ساتھی کے وکیل نے عدالت سے کہا کہ ان سے کہا جائے کہ رقم واپس کرنے کا طریقہ کار بتائیں کہ ماہانہ کتنی رقم واپس کریں گے، اس نے عدالت کو طریقہ کار بنایا۔ کیس کے فیصلہ کے بعد ان صاحب نے ہمارے ساتھی سے کہا کہ میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں جاکر تمہیں مزید دس سال تک لٹکا سکتا تھا، لیکن اب میری عمر ۸۰ سال سے زیادہ ہوگئی ہے، اب جسم ساتھ نہیں دے رہا ہے، اس لئے ماہانہ طور پر تمہیں اتنی رقم واپس کرتا رہوں گا۔

اس طرح کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری دلیں سخت ہوگئی ہیں اور ہم ملعون دنیا پر فریفتہ ہوگئے ہیں، اس کے لئے ہر طرح کے انسانی اور اخلاقی اقدار کو پامال کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

آپ نے بہت کم سنا ہوگا کہ کسی نے غریب آدمی کو پانچ دس لاکھ روپے تعاون کے طور پر دیئے ہوں، اگرچہ معاشرہ میں ایسے خوش نصیب افراد بھی موجود ہیں، لیکن بہت کم ہیں، جب کہ دھوکہ سے لوگوں سے لاکھوں روپے لوٹنے والے افراد کافی مقدار میں موجود ہیں، جو حقوق العباد غصب کرنے میں مصروف ہیں، اگر انہیں اس بات کا یقین ہو کہ آخرت میں انہیں اس کی کتنی ہولناک سزا بھگتنی ہوگی تو شاید وہ اس گناہ سے باز آجائیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اصلاح فرمائے اور لوٹ مار کی اس حالت کو تبدیل فرمائے۔

خوشگوار زندگی

ہر انسان خوشگوار زندگی کے حصول کے لئے کوشاں ہے، دولت بھی اس لئے مطلوب ہے تاکہ خوشگوار زندگی حاصل ہوسکے، لیکن موجودہ دور میں خوشگوار زندگی ہے، جو دور سے دور تر ہوتی جارہی ہے۔

قرآن خوشگوار زندگی کو ایمان اور عمل صالحہ سے وابستہ کرتا ہے۔ **من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحینہ حیوٰۃ طیبہ** (جو صالح عمل کرتا ہے وہ چاہے مرد ہو یا عورت اور صاحب ایمان بھی ہو تو ہم اسے اسی دنیا میں پاکیزہ زندگی (لذیذ زندگی اور خوشگوار زندگی عطا کرتے ہیں)

اسی دنیا میں پاکیزہ زندگی، لذیذ زندگی اور خوشگوار زندگی کا وعدہ ایمان و عمل صالحہ سے کیا گیا ہے، عمل صالحہ میں جتنی ترقی ہوتی رہتی ہے، اسی حساب سے خوشگوار زندگی اور سکون وسکینت میں اضافہ ہونے لگتا ہے اور فرد کی شخصیت ہر طرح کے غم وحزن سے بچکر ٹھہراؤ سے عبارت ہونے لگتی ہے۔

اعمال صالحہ کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس سے شخصیت ہر اعتبار سے مستحکم ہو جاتی ہے، اللہ سے مستحکم تعلق فرد کو نئی زندگی عطا کرتا ہے اور اسے ایمان کی حلاوتوں سے بہرہ ور کرتا ہے اور دنیا میں بڑی سی بڑی مشکلات بھی اس کے دل کے نظام کو بگڑنے نہیں دیتا، جب کہ مادی نوعیت کی خوشحالی سے حرص وہوس کی نہ ختم ہونے والی زندگی شروع ہوتی ہے، جو موت تک جاری رہتی ہے، جس سے دل ظلمات اور تاریکی سے بھر جاتا ہے، اضطراب وبے قراری کا احاطہ ہونے لگتا ہے، پاکیزہ اخلاقی زندگی سے دوری ہونے لگتی ہے اور مفادات مقصود بن جاتے ہیں۔

اس لئے دولت و دنیا سے خوشگوار زندگی کا نہ صرف حصول ناممکن ہے، بلکہ اس سے شخصیت داخلی طور پر ویرانی کی حالت سے دوچار ہونے لگتی ہے، اچھے لباس اور اچھے مکان میں رہنے والا فرد عموماً زیادہ غمگین ہوتا ہے، اس لئے کہ دنیا میں محویت کی خاصیت ہی دل کی ویرانی کی حالت ہوتی ہے اور حرص و ہوس کے بت سکون نہیں دے سکتے۔

جب خوشگوار زندگی ایمان و عمل صالحہ کی ترقی سے وابستہ ہے تو ایمان و عمل صالحہ کے لئے مجاہدوں سے کام کیوں نہیں لیا جاتا؟ اس کا سبب یہ ہے کہ نفس پر عمل صالحہ (اور پاکیزہ اخلاقی زندگی جو عمل صالحہ کا حصہ ہے) شاق گزرتی ہے، اس سے نفس کو تکلیف اور اذیت ہوتی ہے، جب کہ دولت، دنیا اور خوشحال مادی زندگی سے نفس کی حالت شاداں و فرحاں ہوتی ہے، دنیا سے نفس کی اس خوشی سے دل اور روح کی حالت مردہ کی سی ہو جاتی ہے، خوشگوار زندگی کا تعلق دل روح سے ہی تو ہے، جب دل اور روح مردگی سے دوچار ہو جائیں تو خوشی اور تسکیں کی زندگی کیسے حاصل ہو گی؟

یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ عمل صالحہ کی حقیقی زندگی اس وقت حاصل ہوتی ہے، جب فرد اللہ کے ساتھ یکسو ہو جاتا ہے۔ اور اپنی زندگی کی ایک ہی سمت متعین کرتا ہے، وہ خدا پرستی کی سمت ہے اور دوسری طرف دیکھنے کا روادار ہی نہیں ہوتا، یعنی خوشحال مادی زندگی کی فکر سے دستبردار ہو جاتا ہے اور خواہشات پر غلبہ پالیتا ہے، اس کے انعام کے طور پر ہی عمل صالحہ کی حقیقی زندگی نصیب ہوتی ہے اور پھر اعمال صالحہ سے خوشگوار اور پاکیزہ زندگی عطا ہوتی ہے، یہ نکتہ اس لئے بیان کیا گیا کہ یہ غلط فہمی ہے کہ اگر اعمال صالحہ کے ساتھ کچھ دنیاداری بھی ہوتی رہے اور کچھ خواہشات کی پیروری بھی تو اس سے فرد کی دینداری متاثر نہیں ہوتی۔

خوشگوار زندگی کے مقابلے میں تنگ حالی کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے یا معاشی تنگی، اس سلسلے میں بھی قرآن کی آیت ہے، **ومن اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا ونحشره یوم القیٰمة اعمیٰ** (جو میرے ذکر سے اعراض کرے گا، (یعنی منہ موڑے گا) اس کی معاشی زندگی تنگ کر دی جائے گی اور قیامت کے دن اسے اندھا اٹھایا جائے گا۔)

یہ آیت اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ خوشگوار معاشی زندگی کا تعلق ذکر سے ہے (جس میں قرآن کی تلاوت شامل ہے) اگر ذکر نہ ہو گا تو بظاہر وسائل کی فراوانی کے باوجود معاشی ضروریات پوری ہونے کا نام ہی نہیں لے گی، نیز حرص و ہوس کی نہ ختم ہونے والی حالت پیدا ہوتی رہیں گی اور ہائے دنیا کے جہنمی احساسات بڑھتے رہیں گے۔

زندگی کے تین نقطہ نگاہ

جدید دور میں زندگی کے تین نکتہ نگاہ ہیں، جن کے تحت زندگی گزری جارہی ہے، ایک نکتہ نگاہ خدااور مذہب سے بے گانہ قوموں کا ہے، جس کے تحت کل زندگی یہی مادی زندگی ہی ہے، موت سے انسان کا خاتمہ ہے، اس لئے صلاحیتوں اور توانائیوں کو مادی مقاصد ہی کے لئے استعمال کرنا ہے اور عیش و عشرت مقصود حیات ہے، جب دوسری دنیا نہیں ہے تو دنیا میں لذت کے ساتھ زندگی گزارنے یا دوسروں پر بالادستی حاصل کرنے یا ظلم و ستم روا رکھنے کے لئے جو کچھ بھی کیا جاسکتا ہے، کرنا ہے، اس کے لئے قوت کا حصول ضروری ہے، قوت حاصل کرنے کے لئے جدید سے جدید تک ٹیکنالوجی تک رسائی ہونی چاہئے۔

اس نکتہ نگاہ کا لازمی نتیجہ مال اور قوت اور برتری حاصل کرنے کے لئے دوسری قوموں سے معرکہ آرائی کرنی ہے، بظاہر چاہے نام انسانیت دوستی انسانیت نوازی کا ہو، لیکن عملا قوموں کو مفتوح کرنا ہے۔

زندگی کے اس نکتہ نگاہ سے الحاد و دھریت کا تصور وابستہ ہے، جو عیسائی مذہب کے خلاف شدید ردعمل اور آزاد خیالی، دانشوروں کے دین و مذہب سے سرکشی پر مشتمل مزاج اور مغرب میں صنعتی انقلاب کے علمبرداروں کی کاوش کا نتیجہ ہے، مغرب پچھلے دو ڈھائی سو سال سے علمی اور فکری طور پر الحاد و ہریت کی تحریک کا مرکز بنا ہوا ہے، وہاں فکری اور علمی دنیا میں خدا کا نام لینا تک ایک عجوبہ ہے، کانٹ جیسا متوازن فکر کا حامل فلاسفر اپنی کتابوں میں عقل کی بے بسی اور ایمان کی بات تو کرتا ہے، لیکن وہ کھل کر اپنی کتابوں میں خدا کے عقیدے کا اقرار نہیں کرتا، اس سے مغرب کی خدا بیزاری والی روش کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مغرب کی غلامی کے دور میں مسلمان ممالک میں انگریزی تعلیم یافتہ اہل علم میں الحاد و دہریت کو کافی فروغ ملا تھا، آزادی کے بعد اب دوبارہ جدید میڈیا کے ذریعہ خالی ذہن مسلمان نوجوانوں میں الحاد

و دہریت کے اثرات کافی بڑھ رہے ہیں، پہلے اس فکر کا سرگرم علمبردار سوویت یونین بھی تھا، لیکن سوویت یونین کے ٹوٹنے اور کمیونزم سے بیزاری کے بعد اب الحاد و دہریت کی تحریک کا علمبردار مغرب ہی ہے۔

مغرب کے سرمایہ دار کا مفاد اس سے وابستہ ہے کہ دنیا میں الحاد و دہریت کی تحریک کو تقویت حاصل ہو، تاکہ خواہشات پر مبنی اس کی صنعت اور ٹیکنالوجی کو فروغ ملے اور خدا اور مذہب سے آزاد کلچر کے لئے فضا پوری طرح ہموار ہو۔

خدا اور مذہب سے سے بے گانگی کا نتیجہ اس کے علاوہ کچھ اور ہو نہیں سکتا، اس طرح کی قوموں کو جسم و جان بہت عزیز ہوتا ہے، وہ دنیا پر ٹوٹ پڑتی ہیں، اس لئے ان کی فوج جنگوں میں خدا پر یقین رکھنے والی قوموں کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتی، جس طرح افغانستان میں ہوا کہ پتھر کے زمانے میں رہنے والی مسلم ملت سے پوری مغرب نے شکست کھائی، دس سال تک زور آزمائی کرنے اور ساری عسکری اور ٹیکنالوجی قوت کے استعمال کے باوجود انہیں بے ہتھیار مسلمانوں سے راہ فرار اختیار کرنا پڑا۔

اس طرح کی قوموں کا سارا زور جدید سے جدید ٹیکنالوجی کے حصول کے ذریعہ اس ٹیکنالوجی سے محروم قوموں کو خوف زدہ اور مرعوب کرنا ہے اس حکمت عملی میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

زندگی کے اسی نکتہ نگاہ کا دوسرا حصہ سیکولرزم کا ہے، جس کے مذہب کا دائرہ کار مسجد، مندر اور کلیسا تک محدود ہے، اجتماعی زندگی میں مذہب کو کوئی عمل دخل نہیں ہے، اجتماعی زندگی عقل اور عقلیت کے زیر اثر خواہشات کے تحت گزاری جائے گی، انفرادی طور پر خدا

اور مذہب کا عقیدہ رکھنے کی تو سب کو اجازت ہے، لیکن یہ اجازت محدود دائرہ تک ہو گی، سیکولرزم مغرب سے شروع ہوا جو اب مسلمان ملکوں تک پھیل گیا ہے۔

زندگی کے اس نکتہ نگاہ کے موجب آزاد طرز معیشت اور آزاد طرز معاشرت وغیرہ یہ انسان کا خاصہ ہیں اور اس سے انسانی حقوق وابستہ ہیں، اس آزادی میں مداخلت نہیں ہو سکتی اگرچہ مسلمان ممالک نے سیکولرازم کے ایک ہی حصہ کو اختیار کیا ہے، لیکن وہ سیکولرزم کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔

زندگی کا دوسرا نکتہ نگاہ خوشحال مادی زندگی ہے، جس کے تحت کھانا پینا، سونا، عیش وعشرت کرنا، مادی حسن سے محظوظ ہونا اور دولت کمانا یہی مقصود حیات ہے، یہ نکتہ نگاہ بھی مغرب سے شروع ہوا تھا، مسلم ممالک کی نوجوان نسل اس نقط نگاہ کی حامل ہوتی جارہی ہے، جدید ٹیکنالوجی اس نکتہ نگاہ کو تیزی سے متعارف کررہی ہے۔

زندگی کے ان دونوں نکتہ نگاہ کا حاصل خدا اور مذہب سے دوری کا ہونا ہے، اس مقصد کے لئے جدید علم کلام، جدید استدلال اور جدید فکری نظام سامنے آیا ہے، جو تقریبا پچھلے دو ڈھائی سو سال سے اپنا کام کررہا ہے، اس پر ہزاروں دانشوروں نے کام کیا ہے اور اپنی زندگیاں صرف کرکے زندگی کے ان دونوں نکتہ نگاہ کو متعارف اور مقبول بنایا ہے۔

زندگی کا تیسرا نکتہ نگاہ اسلام کا ہے کہ زندگی اللہ کی تخلیق ہے اور اس کی حیثیت امتحان گاہ کی سی ہے، اس امتحان سے مقصود یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کی زمین پر اللہ کے وفادار اور مہذب انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنے اور اپنی آزاد مرضی سے دستبردار ہو کر اللہ کی مرضی کے تحت صرف کررہے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں جو دنیا کو مقصود بنا کر اللہ سے

سرکشی پر مبنی زندگی گزار رہے ہیں، ان دونوں قسم کے انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ہے۔

پہلے قسم کے لوگوں کے لئے اللہ کی طرف سے ابدی زندگی کی راحتوں کا سامان تیار ہے، جب کہ دوسری قسم کے لوگوں کے لئے اللہ کی طرف سے ابدی زندگی میں سخت سزا کا انتظام موجود ہے۔

زندگی کے اسلامی نکتہ نگاہ کے تحت اس دنیا میں افراد کو اپنی آزاد مرضی سے ہر صورت میں دستبردار ہو کر اللہ کے دیئے ہوئے دستور حیات کو اختیار کرنا ہے۔

زندگی کے یہ تینوں نکتہ نگاہ ہیں جس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

خدمت خلق کے کام سے

انسانیت کا پیدا ہونا

خدمت خلق بالخصوص غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی مالی معاونت اور مدد کا کام ایسا ہے، جو اسلام کا بھی حصہ ہے تو انسانیت کا تقاضا بھی۔ اس سے دینی ترقی بھی ہوتی ہے تو انسانی اقدار کو فروغ بھی ملتا ہے، اللہ کے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ یتیموں، مسکینوں اور محتاجوں کی مدد کرنا جہاد سے بھی افضل ہے، قرآن میں بھی اس کی بار بار تاکید فرمائی گئی ہے، چونکہ مال سے زندگی وابستہ ہے، مال نہ ہو تو فرد سنگین مسائل کا شکار ہونے لگتا ہے، اس لئے غریبوں کی مدد کو فیصلہ کن اہمیت دی گئی ہے۔

ایسا معاشرہ جس میں غریبوں کی پرساں حالی کا انتظام ہوتا ہے، اس معاشرے کے افراد اللہ کی طرف سے نوازے جاتے ہیں، ان کے دلوں میں انسانی جذبات اور نرمی پیدا کردی جاتی ہے، جو افراد مالی وسائل ہونے کے باوجود غریبوں سے شفقت کا معاملہ نہیں کرتے، ان کے دلوں کو سخت کردیا جاتا ہے جو بڑی سزا ہے۔

بے کس انسانیت کے کام آنا، ایک نیکی نہیں ہے، بلکہ بہت ساری نیکیوں کو سمیٹنا ہے، بدقسمتی سے خود غرض معاشرے میں اس کام کو اہمیت نہیں دی جاتی، جس کی وجہ سے بے کس اور محتاج انسانیت سسکتی رہتی ہے اور اپنی بے بسی کا رونا اللہ کے سامنے روتی رہتی ہے۔

بزرگوں کے ہاں یہ معمول رہا ہے کہ وہ خدمت کے کام کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں اور اس کام میں زیادہ وقت صرف کرتے ہیں، ان کو کھانا کھلانا، ان کی مالی معاونت کرنا اور مقتدر افراد کے نام ان کو سفارشی خطوط لکھکر دینا ان کے لوازمات میں رہا ہے، ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وقت کا بادشاہ ان کا معتقد تھا، ان کے اصرار سے بزرگ کبھی کبھار ان کی مجلس

میں شریک ہوتے تھے، لوگوں کو یہ معلوم تھا، چنانچہ غریب لوگ بادشاہ کے نام اپنی درخواستیں لکھکر ان کے تھیلے میں رکھ دیتے تھے، بادشاہ ان درخواستوں کو پڑھکر ان پر متعلقہ افسروں کے نام نوٹ لکھکر وہ درخواستیں تھیلے میں رکھ دیتے تھے، جب یہ معمول بہت زیادہ ہوگیا تو بادشاہ نے بزرگ سے کہا کہ اب بہت زیادہ ہوگیا ہے اب بس کریں، بزرگ نے وعدہ کیا کہ اب ایسا نہیں کریں گے، بزرگ نے تو یہ ارادہ کیا تھا لیکن لوگوں نے اللہ کا واسطہ دے کر درخواست کی کہ آپ کی وجہ سے ہماری مشکلات دور ہوتی ہیں، چنانچہ بزرگ نے پھر وہی عمل شروع کیا، بادشاہ نے کہا کہ آپ نے تو وعدہ فرمایا تھا، بزرگ نے کہا کہ لوگوں نے درمیان میں ایسی ہستی کا واسطہ دیا کہ مجھے شرم آئی کہ میں اس ہستی کے نام کو مسترد کردوں، بادشاہ نے کہا کہ آپ کو اجازت ہے، آپ نیکی کے اس کام کو جاری رکھیں۔

لوگوں کے کام آنے اور خدمت خلق سے بظاہر تو مال میں کمی محسوس ہوتی ہے اور وقت صرف ہوتا ہے، لیکن عملاً فرد برکت کے ایسے نظام کا حصہ بن جاتا ہے، جہاں قدرت کی طرف سے اس کی مشکلات دور ہونے لگتی ہیں، اس کو پیش آنے والے حادثوں سے بچالیا جاتا ہے اور وہ راحت اور سکوں سے نوازا جاتا ہے، آخرت میں درجات کی بلندی کی صورت میں اس کا جو اجر حاصول ہوگا وہ تو سب سے بڑی سعادت ہوگی۔

ہم سے جتنا ہو سکے غریبوں اور محتاجوں کے کام آئیں، اس سے دینی ترقی کے ساتھ ہماری انسانیت کو بھی جلا ملے گی۔

دوسروں کے عیبوں کو دیکھنے کے بجائے
اپنے عیبوں کو دیکھنا

انسان کی یہ خاصیت ہے کہ جب وہ دوسروں کے عیبوں کو دیکھتا ہے تو اسے اپنے عیب بالکل بھی نظر نہیں آتے، اگر دوسروں کے عیبوں کو دیکھنے کی نفسیات پختہ ہو جائے تو پھر وہ اپنی اصلاح سے محروم ہو جاتا ہے، نفس کی یہ خواہش اور کاوش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بڑے بڑے عیبوں سے صرف نظر کرکے، دوسروں کے چھوٹے چھوٹے عیبوں پر مصنوعی اضطراب محسوس کرے اور اس کا دوسروں سے تذکرہ کرتا رہے، فرد کی یہ نفسیات ایسی ہے جو عام طور پر شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے، جو سراسر خسارہ کا سودہ ہے اور دنیا و آخرت میں فرد کی رسوائی کا ذریعہ بھی۔

عیبوں سے کون خالی ہے، انسان تو سراپا عیبوں سے عبارت ہے، کسی میں کم عیب ہیں تو کسی میں زیادہ، حقیقی دانشمند وہی ہے، جو خود احتسابی سے کام لے کر اپنے عیبوں کو سمجھے اور پھر انہیں دور کرنے کی کوشش کرے۔

خود احتسابی کے حامل فرد کے پاس تو اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں کے عیبوں کو دیکھتا رہے۔

فرد کی اگر قابل ذکر حد تک اپنی اصلاح ہو جائے تو یہ اتنی بڑی سعادت ہے کہ دنیا بھر کی سعادتوں سے بھی زیادہ، لیکن بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں، جو اس کام کو سب سے بڑا اور حقیقی کام سمجھکر اس کے لئے کوشاں ہوں۔

ایک حدیث شریف ہے کہ اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے جو کسی مسلمان کو ضرر پہنچائے اور یا اس کے ساتھ فریب کرے۔''

کسی مسلمان کے عیبوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا، یہ اسے ضرر پہنچانا ہی ہے اور اس کی عزت کو مجروح کرنا بھی ہے۔ مسلم معاشرے کی وحدت اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کے بارے میں حسن ظن رکھے اور اگر اس میں عیب موجود بھی ہیں تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد کردے، بلکہ اس سے بھی بہتر صورت یہ ہے کہ اس کے لئے اللہ سے دعا کرے کہ یا اللہ تو اسے معاف فرمائے۔

یہ عمل ایسا ہے جو اللہ کو بہت زیادہ پسند ہے، اس عمل کے صدقے میں اللہ تعالیٰ خود اس شخص پر رحم کرکے اس کی اصلاح کی صورت پیدا فرماتا ہے۔

حقیقی بزرگی، تزکیہ، محبت اور روایتی بزرگی

فرد زندگی میں سب سے زیادہ جس سے متاثر ہوتا ہے، وہ اس کا دوست ہوتا ہے، دوست کی صحبت کے زیر اثر وہ اپنی زندگی کو دوست کے مطابق استوار کرنے لگتا ہے، دوست کے ذریعہ اپنے آپ کو بدلنا یہ جبری عمل نہیں ہوتا، بلکہ دوستی میں کچھ تاثیر ہی ایسی رکھی گئی ہے کہ فرد نہ چاہتے ہوئے بھی دوست کی زندگی سے ہمہ آہنگ ہونے لگتا ہے، اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ فرد دوست کے دین پر ہوتا ہے، دوستی اور صحبت ہم معنٰی ہے، ان دونوں کے اثرات حیرت انگیز ہوتے ہیں، بزرگ کے ساتھ دوستی، دوستی کی سب سے بہتر صورت ہے۔

(۲)

موجودہ دور میں ہر باصلاحیت شخص میں بڑا بننے کا خبط موجود ہے، کسی کو بڑا بننے کے مواقع ملتے ہیں، کسی کو نہیں، لیکن بڑا بننے کی آرزو لگ بھگ سب کی ہوتی ہے، اس لئے کہ بڑا بننے سے شہرت بھی حاصل ہوتی ہے تو مالی فوائد بھی۔ بڑا بننے سے دستبردار ہونا مشکل ترین کام ہے، اس کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ کسی صاحب دل اور صاحب معرفت شخصیت سے دوستی کا تعلق مستحکم کیا جائے، اس سے رفتہ رفتہ بڑائی کی بنیاد کمزور ہوتی جائے گی، صاحب معرفت اور صاحب دل شخصیت کو ہم بزرگ بھی کہہ سکتے ہیں۔

بڑائی کا جذبہ اور خواہش ایسی چیز ہے جس سے بہت ساری بُرائیاں جنم لیتی ہیں، بڑائی کا جذبہ دولت، علم، آفسری اور عبادت اور ذکر و فکر سے بھی پیدا ہوتا ہے، عبادت اور ذکر و فکر سے بعض اوقات اپنے آپ کو افضل سمجھنے اور دوسروں کو کمتر سمجھکر ان کو ہدف ملامت بنانے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔

بزرگ جو اپنے بزرگ کی سرپرستی میں زندگی کا ایک حصہ رہ کر صحبت کے انوار اور ذکر و فکر کے غیر معمولی مجاہدوں سے بڑائی کے خبط کو نکال کر اپنے آپ کو مہذب بنانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکا ہوتا ہے، اس طرح کی شخصیت سے اپنے دل کے تعلق کو قائم رکھنے سے جو فوائد و ثمرات حاصل ہوتے ہیں، ان میں سے کچھ فوائد یہ ہیں۔

• بڑائی کا جذبہ رفتہ رفتہ اندر سے نکلنے لگتا ہے • دولت، آفسری اور علم وغیرہ کے مضر اثرات سے نجات کی صورت پیدا ہوتی ہے • مذکورہ طبقات یعنی دولت، آفسری اور علم کے صاحبان معاشرے کے لئے نافع ثابت ہوتے ہیں • یہ طبقات عاجزی کے مقام پر آجاتے ہیں، جہاں وہ اپنے آپ کو کم تر سمجھنے لگتے ہیں، • باطن کی وسیع دنیا کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے، جس سے فرد نفس کی حیرت انگیز قوت سے بچنے میں کامیاب ہوتا ہے • نفسیاتی نوعیت کی خرابیوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے • عبادت اور معاملات وغیرہ میں اخلاص کی حالت پیدا ہونے لگتی ہے، • فرد دوسروں کو اذیت اور نقصان پہنچانے سے خوف زدہ ہوتا ہے • ذکر و فکر کے مجاہدوں کے لئے طبیعت آمادہ ہونے لگتی ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس لئے ہوتے ہیں کہ صاحب دل شخصیت اپنے نفس کو فنائیت کے مراحل سے گزار کر حالت بقا میں لانے میں کامیاب ہوتی ہے، اس کے بعد اللہ تعالٰی اپنے فضل سے اس کی شخصیت میں ایسی تاثیر رکھتا ہے کہ حقیقی طلب کی نیت سے اس سے وابستگی اور اس کے قائم کردہ ذکر کے حلقوں میں شرکت سے فرد کو نئی زندگی اور طاقتور پاکیزہ احساسات سے سرشار زندگی ملنے لگتی ہے۔

اس دور میں عقلیت کے غلبے کے زیر اثر صاحب دل شخصیت کے صحبت کے ان اثرات کو سمجھنے میں بُری طرح ناکامی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے بڑائی کے جذبے اور دیگر باطنی خرابیوں نے معاشرے کو مسموم کر دیا ہے۔

افراد کو اگر اس صحبت کا معمولی بھی ادراک حاصل ہو جائے تو وہ لپک کر اس سے تعلق قائم کریں۔

(۳)

حدیث شریف میں اللہ کے رسول اللہ ﷺ کی دعا آتی ہے کہ یا اللہ مجھے اپنی محبت عطا فرما اور ان لوگوں کی محبت جو تجھ سے محبت کرتے ہیں اللہ سے محبت کرنے والے بس اللہ کی محبت میں ہی زندگی گزار دیتے ہیں، انہیں ہر وقت یہی فکر غالب رہتی ہے کہ کہیں ایسا کام سرزد نہ ہو، جس سے اللہ ناراض ہو اور اللہ سے محبت کا عمل متاثر ہو، اللہ کی محبت انہیں سب سے بے نیاز کر دیتی ہے، یہ محبت ہی ایسی ہے، جس کی حلاوت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اللہ کی یہی محبت اللہ والوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے، لیکن محبت کا ایک ارتقائی عمل ہے جو راہ محبت میں مسلسل چلتے رہنے اور اللہ والوں سے لگاتار صحبت کا تعلق قائم رکھنے سے حاصل ہوتی ہے، جو شخصیت کو اندر سے پوری طرح بدل دیتی ہے۔

صحبت کی ضرورت اس لئے ضروری ہے تاکہ اللہ کی محبت کا رنگ غالب ہو، جب یہ رنگ غالب ہوتا ہے تو سارے رنگ مٹ جاتے ہیں، کپڑے پر رنگ چاڑھنے کا عمل رنگ ساز کرتا ہے، فرد خود اپنے طور پر یہ عمل نہیں کرتا، اس کے لئے وہ رنگ ساز کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔

(۴)

بزرگی بڑا نازک مقام ہے، جو آسانی سے نہیں ملتی، اس کے لئے زندگی کا طویل عرصہ محبوب حقیقی کے لئے فراق کے غم میں خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں اور جسم و جان کی توانائیوں کو صرف کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد کہیں جا کر، شہرت، عزت، مال و متاع کی محبت مدھم ہوتی ہے، یہ ہم جیسے افراد کے بس کی بات نہیں ہے، ہمیں اگر زندگی بھر اس طرح کے بزرگوں کی صحبت کی توفیق حاصل ہو تو یہ ہماری بڑی سعادت ہے، بزرگی میں اپنی شخصیت کو کلی طور پر مٹانا پڑتا ہے، دنیا سے دستبردار ہونا پڑتا ہے، اپنے آپ کو حقیقتہ سیاہ کار سمجھنا پڑتا ہے، اس لئے کہ جس ہستی سے محبت کا تعلق ہوتا ہے، وہ ہستی اتنی زبردست شان عظمت کی حامل ہے کہ وہ کسی بات پر نالاں ہو کر سارے مجاہدوں کو معطل کر کے شخصیت کو اپنے در سے نکال سکتی ہے، چونکہ مجاہدوں کی حامل شخصیت کو اللہ کی شان عظمت کا کسی حد تک مشاہدہ ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنے آپ کو لاش سمجھتے ہوئے اس ذات کے حقیر بندے کی حیثیت سے زندگی گزارتا ہے۔

ایسا شخص اگر مل جائے تو اس کی صحبت مسلسل سے ہی فرد نوازا جاتا ہے، اور اسے نفس کے سارے حربوں سے آشنا کر کے اس پر قابو پانے کی استعداد عطا کی جاتی ہے۔

(۵)

موجودہ دور کی بزرگی میں عام طور پر یہ بات نہیں ہے، اس لئے کہ مطلوبہ مجاہدوں سے پہلے ہی بزرگی کی مستند پر بٹھایا جاتا ہے، چنانچہ شہرت اور دولت کے جذبات کروٹ لینے لگتے ہیں، اگر انہیں مالداروں کی معیت حاصل ہو تو وہ جلد ہی صاحب املاک بن جاتے ہیں اور بزرگی کے نام پر شان مان کی زندگی گزارنے لگتے ہیں، اس لئے موجودہ دور میں کسی کے ہاتھ

میں ہاتھ دینے سے پہلے سو مرتبہ سوچنا پڑتا ہے، ورنہ ایک مرتبہ قابو میں آنے کے بعد کچھ کیفیات، ظاہری دینداری اور کچھ روحانیت کے اجزاء حاصل ہونے سے فرد یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسے سب کچھ حاصل ہو گیا، حالانکہ ابھی تو اسے باطن میں موجود وسیع دنیا اور باطنی امراض سے واسطہ ہی نہیں پڑا ہے، یہ واسطہ پڑنا مشکل بھی ہے، اس لئے کہ وہ جس شخصیت سے وابستہ ہے، وہ ان حالات سے گزرا ہی نہیں ہے۔

آج کل بزرگی کے نام پر یا تو روایتی بزرگی ہے کہ بزرگی اولاد میں منتقل ہوتی ہے یا پھر سرسری مجاہدوں کی ذریعے سلوک طے کروا کر مسند پر بٹھایا جاتا ہے، موجودہ دور میں متعارف بزرگی یہی ہے، جسے مستند بزرگی کی حیثیت حاصل ہے، اس سے زیادہ سے زیادہ جو فائدہ حاصل ہو سکتا ہے وہ رسمی اور ظاہری دینداری اور کچھ روحانی کیفیات ہیں۔

اس سے باطن کی وسیع دنیا کی اصلاح نہیں ہوتی۔

ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو اتنی اصلاح بھی قابل قدر ہے، لیکن اس سے معاشرے کو تزکیہ نفس کے حامل افراد نہیں مل پاتے، جو اپنے کردار سے معاشرے میں روشنی پھیلانے اور دنیاداری کے اثرات کم کرنے کا باعث ہوں۔

ماتحتوں سے حسن سلوک کی اہمیت

موجودہ دور میں دفتروں میں کام کرنے والے ماتحت یا مزدوری کرنے والے ماتحتوں کی حالت اچھی نہیں ہے، ان سے حسن سلوک کا معاملہ کرنے کے بجائے ان کی تذلیل کی جاتی ہے، یہ روش اسلام اور خود انسانیت کے منافی ہے، تربیت کے فقدان اور اصلاح نفس سے بے نیازی کی وجہ سے آفسروں، عہدیداروں اور مالداروں میں اشتعال کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے، اس نفسیات کا مظاہرہ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ کرتے ہیں کہ تھوڑی تھوڑی بات کی وجہ سے ان کی ڈانٹ ڈپٹ کرنا اور تذلیل کرنا یہ روش عام ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے ماتحت افراد جو عام ملازم ہوں یا مزدور، وہ نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک سنگین مسئلہ ہے، جس کی طرف توجہ ہونا ضروری ہے، اس طرح کی قانون سازی ہونی ہے کہ ماتحتوں کی تذلیل کو پولیس کیس بنالیا جائے، تاکہ متعلقہ ملازم ہر وقت شکایت کر کے آفیسر، عہدیدار اور مالک کو سزا دلا سکے۔

ایک حدیث شریف ہے کہ ایک صحابی نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ میں اپنے غلام کے (قصوروں کو) دن میں کتنی بار معاف کروں، آپ ﷺ خاموش رہے، صحابی نے تین بار سوال دہرایا، آپ نے فرمایا، دن میں ستر بار (ستر کا لفظ کثرت کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ کثرت سے معاف کرو)۔

دوسری حدیث شریف ہے کہ ایک شخص اپنے غلام کو مار رہا تھا، آپ ﷺ نے دیکھ لیا اور صحابی نے جب صورتحال دیکھی تو اس نے کہا کہ میں نے غلام کو آزاد کیا، آپ ﷺ نے فرمایا تم اگر ایسا نہ کرتے تو غلام کو مارنے کی وجہ سے آخرت میں اس کی سزا بھگتتے۔ (حدیث کا مفہوم)

حضور ﷺ نے اپنے وصال کے وقت جو آخری وصیت فرمائی، وہ دو چیزوں کی وصیت ہے، ایک نماز کی کہ اس کا اہتمام کرو، دوسری وصیت اپنے ماتحتوں سے حسن سلوک کی ہے۔

اس سے اندازہ لگائیں کہ اسلام ماتحتوں کی عزت نفس کو برقرار رکھنے کے کام کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔

ہماری زندگی کو لاحق مختلف روگ

اس وقت انسانیت بہت سارے مسائل سے دوچار ہے، ایمان سے محروم قوموں کے مسائل زیادہ سنگیں ہیں، اس لئے کہ وہ کائنات کی خالق ہستی پر ہی یقین نہیں رکھتی، ایسی قومیں جتنے بھی مسائل اور فکری انتشار کا شکار ہوں، کم ہے، جدید ٹیکنالوجی کا غرور اور کثرت دولت یہ دونوں چیزیں بجائے خود اتنے بڑے امتحان ہیں کہ وہ انہیں آرام کی نیند ہی سونے نہیں دیتے، یہ قومیں بظاہر چاہے ہمیں کتنی ہی خوبصورت اور خوش نظر آئیں، لیکن ان کی دل کی دنیا سخت ویرانی سے دوچار ہے، قرآن میں ہے کہ ان اہل کفار کے مال واولاد سے تم تعجب نہ کرو اللہ چاہتا ہے کہ اس سے (یعنی دولت اور اولاد سے) ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دے۔ (التوبہ آیت نمبر ۵۵)

اگرچہ مسلمان ایمان کی دولت سے بہرہ وری کی وجہ سے اہل کفر سے ہزار گنا زیادہ بہتر ہیں، تاہم تربیت کے فقداں اور مادیت پرستی کی طوفانی لہروں کی وجہ سے وہ بھی اخلاقی اور روحانی طور پر سنگیں مسائل سے دوچار ہیں۔

ذیل کے مضمون میں مسلمانوں کو لاحق روگوں کا ذکر کیا گیا ہے، الحمدللہ مسلمانوں کی کافی تعداد ایمان پر محنت کی برکت سے ان روگوں سے بڑی حد تک محفوظ ہے، تاہم اکثریت ایسے افراد کی ہے جو صحیح ماحول سے محروم ہونے کی وجہ سے ذکر کردہ روگوں میں کم یا زیادہ روگوں میں مبتلا ہے۔ (محمد موسیٰ بھٹو)

ہمارے معاشرے کو مختلف روگ لاحق ہیں، رشوت کا روگ ہے، سرکاری خزانہ پر ہاتھ صاف کرنے کا روگ ہے، غریبوں کی پرسان حالی نہ ہونے کا روگ ہے، بڑھتی ہوئی مہنگائی کا روگ ہے، ڈاکٹروں کی معائنہ فیس اور بہت زیادہ آپریشن فیس کا روگ ہے، زیادہ سے زیادہ دنیا کمانے کا روگ ہے، دوسروں کی تحقیر کا روگ ہے، معمولی سی معمولی باتوں پر

قطع تعلقی کا روگ ہے، کسی کے کام نہ آنے کا روگ ہے، دوسروں کے لئے ہمدردی کے دو الفاظ نہ بولنے کا روگ ہے، نفسا نفسی کا روگ ہے، اپنی شخصیت کو نمایاں اور آگے کرنے کا روگ ہے، دوسروں کی گلا اور غیبت کا روگ ہے، اپنے علم پر عمل نہ کرنے کا روگ ہے۔

بڑھتے ہوئے حسد وجلن کا روگ ہے، روشن ضمیری سے محرومی کا روگ ہے، کردار سے بے بہری کا روگ ہے، خود اعتمادی سے محرومی کا روگ ہے، طاقت کی حامل قوت سے خوف زدگی کا روگ ہے، مفادات کا شکار ہونے کا روگ ہے، ملی مفادات کو پامال کرنے کا روگ ہے، اصولوں سے پامالی کا روگ ہے، اہل سیاست کا قوم سے مخلص نہ ہونے کا روگ ہے، کاروباری بددیانتی کا روگ ہے، وعدوں اور معاہدوں کی پاسداری نہ ہونے کا روگ ہے۔

غرض کہ اس طرح کے بہت سارے روگ ہیں، جن میں ہم مبتلا ہیں، جس کی وجہ سے ہماری زندگی سے خیر وبرکت رخصت ہوگئی ہے، خوش نصیب ہیں وہ افراد، جو اس طرح کے سارے روگوں سے بڑی حد تک محفوظ ہیں، ایسے خوش نصیب افراد کی صحبت ایسی چیز ہے، جس کے زیر اثر ہماری زندگی بھی اس طرح کے روگوں سے بچ سکتی ہے۔

یہ روگ کس طرح کام کرتے ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اسی ہفتے لاہور میں ایک بہنوئی نے اپنے سالے اور اس کی بیوی کو مار کر ان دونوں پر پیٹرول ڈال کر انہیں جلا دیا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ حسد کی وجہ سے ہوا کہ اس کا سالہ مالی اعتبار سے مستحکم تھا، جب کہ وہ غریب تھا، اس سے برداشت نہیں ہو سکا کہ اس کا قریبی عزیز معاشی اعتبار سے خوشحال ہو اور وہ غریب ہو۔

معاشرے میں اس طرح کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں اور یہ واقعات مذکورہ اخلاقی اور روحانی بیماریوں ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکیزہ تربیت کے نظام سے وابستہ ہوئے بغیر فرد کے لئے حیوانیت کے مظاہر سے بچکر انسانی اوصاف سے بہرہ ور ہونا محال تر ہے۔

اس وقت انسانیت جس بحران سے دوچار ہے، وہ یہ ہے کہ وہ پاکیزہ ماحول کی طرف آنا ہی نہیں چاہتی اور نہ ہی وہ ایسے ماحول کو پروان چڑھنے دینا چاہتی ہے۔

یہ سارے روگ ایمان کی کمزوری ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں، جب تک ایمان طاقتور نہ ہوگا ان روگوں سے بچنا دشوار تر ہے، ایمان کو طاقتور بنانے کے لئے صحبت صالحہ اور ذکر فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔

دینی اعتبار سے شخصیت کا استحکام ضروری ہے شخصیت کے استحکام کے بغیر دوسرے کاموں میں لگنا خسارہ کا سودہ ہے، دینی استحکام سے مراد یہ ہے کہ اخلاق اچھے ہوں، مزاج میں عاجزی ہو، غصہ پر کنٹرول ہو، مزاج کے خلاف باتیں سننے کا حوصلہ ہو، ضد کی نفسیات سے حفاظت ہو دینی معاملات میں چستی ہو۔

نماز میں حضوری کی حالت حاصل ہو، دل کی سلامتی کی فکر ہو، زبان پر کنٹرول ہو، نیکی کے ہر کام کے لئے مستعدی ہو، سیاست اور انقلاب کو دین کی ساری تعلیمات کا حاصل سمجھنے کی بجائے انہیں چیزوں کو جو اسلام کی روح ہیں، تعلق خاطر ہو، اپنی اصلاح کے سلسلے میں ذوق وشوق کی حالت ہو، باتوں سے زیادہ عمل کی عادت ہو، دوسروں سے حسن ظن کا معاملہ ہو، اپنی سیاہ کاری کا احساس غالب ہو، معاشرہ کو دینی اور اخلاقی اعتبار سے بدلنے کی فکر مندی ہو، معاشرہ کی حالت کا رونا رونے کی بجائے اپنی حالت کا رونا جائے کہ کوششوں کے باوجود نفس جان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے، اپنی بساط کے مطابق غریبوں کی پرساں حالی کی کوشش ہو، نوجوان نسل، جنسی ہیجان خیزی کی شکار ہے، اس کی فکر مندی ہو، صبر و تحمل کا مزاج پیدا ہو، عبادت سے رغبت ہو، لوگوں کے قصور معاف کرنے کا میلان ہو، اپنے کردار سے معاشرے میں خوشبو پھیلانا ہو، دوسروں کی تکلیف کو دیکھکر بے چینی پیدا ہو، دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر غالب ہو، جن کے ساتھ رہتا ہو، ان سے حسن سلوک کا معاملہ ہو، دوسروں کی دل آزاری سے بچنے کی کوشش ہو، کوئی معذرت کرے تو اس کی معذرت کو قبول کرتے ہوئے اسے دعا دی جائے۔

یہ وہ خوبیاں ہیں جن سے معاشرہ ٹوٹ پھوٹ سے بچ جاتا ہے اور افراد کی دلیں زخمی ہونے سے محفوظ رہتی ہیں اور انسانی وقار کے منافی کردار سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

یہ کتنے کام ہیں جو کرنے کے ہیں، لیکن دینی کاموں میں بھی وہی کام سوجھتے میں جن میں زبان چلانے سے زیادہ کچھ کرنا نہ پڑے۔

مادیت کی بے رحم طاقتیں

اللہ کا سہارا لئے بغیر چارہ کار نہیں

مسلمان ممالک میں لگ بھگ پچھلے دو سو سال سے مادیت کی جو لہر شروع ہوئی ہے، وہ کم ہونے کی بجائے تیز ہو گئی ہے اور مادیت کی بے رحم طاقتیں ایمان ویقین کے لئے خطرہ بنتی جارہی ہیں، نئی نسلوں کو سنبھالنا بہت زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔

مادیت کی بے رحم طاقتوں نے زندگی کو اجیرن کر دیا ہے، خدا پرستی پر مبنی روحانیت کا ادراک سلب کر دیا ہے، سادگی سے زندگی گزارنے کے سلیقہ سے محروم کر دیا ہے، ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں میں اضافہ کر دیا ہے، قوت برداشت کو ختم کر دیا ہے۔

یہ سارے حالات ایسے ہیں جو خدا فراموشی کا نتیجہ ہیں، ان حالات میں توقع تھی کہ لوگ ہر طرف سے مایوس ہو کر اللہ کی طرف رجوع ہوں گے اپنے غلط اعمال سے صرف نظر کریں گے، اور نئی طاقتور روحانی زندگی اختیار کریں گے اور اس سلسلے میں معاشرے سے ایک نئی تحریک ابھرنا شروع ہو گی، لیکن معلوم ہوتا ہے ہمارا زوال گہرا ہے منفی عادتیں پختہ ہیں اور دل اور ذہن میں مثبت تبدیلی کی امنگ موجود نہیں ہے۔

اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ کسی قوم کے حالات کو تبدیل نہیں کرتا، جب تک وہ اپنے آپ کو خود تبدیل نہیں کرتی، اگرچہ مستقبل قریب میں سیاسی حالات میں تبدیلی کی صورت نظر آتی ہے، لیکن محض سیاسی تبدیلی سے کام نہیں بنتا، اخلاقی اور روحانی تبدیلی کی ضرورت ہے، جس سے اعمال اور اخلاق میں بہتری کی صورت پیدا ہو، اور اپنے جیسے انسانوں سے معاملات میں خوشگواری ہو۔

ہمارے ملک کے ایک ممتاز دانشور صحافی نے بیسویں صدی کے آخر میں لکھا تھا کہ اکیسویں صدی میں جب دنیا اور خود مسلمان ممالک کے حالات بہت زیادہ ابتر ہو جائیں گے،

مہنگائی بڑھے گی، پانی کی قلت پیدا ہو گی، وسائل کی کمی ہو گی، ذہنی پریشانیاں بہت زیادہ بڑھ جائیں گی تو لوگ خدا پرستی پر مبنی روحانیت کا سہارا لینے پر مجبور ہو جائیں گے، اس لئے کہ اس کے بغیر ان کے مسائل کے حل کی ساری صورتیں مسدود ہو جائیں گی۔

ہمارے دانشور صحافی کی اس پیشنگوئی کے پورے ہونے کی اب تک صورت نظر نہیں آتی، ممکن ہے چند سالوں میں حالات تبدیل ہوں اور اللہ کی طرف رجوع کی لہر شروع ہو، لیکن بظاہر ایسا ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔

یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ مادہ پرستی کی قوتوں نے ہمیں اس طرح جکڑ لیا ہے کہ ہم اپنے جملہ معاملات کے حل کے لئے اللہ پرستی پر مبنی روحانیت اور اسلامی تعلیمات کا سہارا لینے کے لئے تیار نہیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جب ایک بار ذہنوں کی تشکیل منفی بنیادوں پر ہو جاتی ہیں تو ان کی تبدیلی کا عمل بہت زیادہ دشوار ہوتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ ہماری اور پوری انسانیت کی حالت زار پر رحم فرمائے۔

ایمان کو بچانے کے لئے فکر مندی کی ضرورت

اس وقت امت سے وابستہ افراد کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ مادی تہذیب کی ہمہ جہتی یلغار کے مقابلے میں اپنے ایمان کو کس طرح بچائیں، اس لئے کہ مادی تہذیب کے علمبرداروں نے پوری انسانیت کو جکڑ لیا ہے، ذہن کو مادی خیالات کی یلغار سے کیسے بچائیں، دل کی دنیاوی اثرات سے حفاظت کیسے ہو، نگاہ کو غیر محرم سے کیسے بچائیں۔

مادی تہذیب اس تیزی سے گھروں اور دلوں تک پہنچ گئی ہے کہ ایمان ہر وقت حالت خطرے میں رہنے لگا ہے، آنے والے وقت میں ہم پوری طرح دجالی تہذیب کے اثرات کی زد میں ہوں گے۔

وہ جو حدیث شریف میں ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب فرد ایمان کو بچانے کے لئے بکریاں لے کر پہاڑ میں چلا جائے گا، پہاڑ کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے تحفظ کے لئے گوشہ نشیں ہو جائے گا، یہ دور اب آگیا ہے۔

ایک حدیث شریف میں ایمان کے تین درجے بتائے گئے ہیں، بُرائی کو طاقت سے روکا جائے، طاقت نہ ہو تو زبان سے روکا جائے، اگر زبان سے بھی نہیں روک سکتا تو بُرائی کو دل میں تو بُرا سمجھے، یہ ایمان کی کم سے کم صورت ہے۔

موجودہ دور میں جو افراد بُرائی کو زبان اور تحریر سے بُرا کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، وہ بڑے سعادت مند افراد ہیں، پہلا درجہ تو اب مفقود ہو گیا ہے، موجودہ دور میں اگر ایمان کا آخری درجہ بھی موجود ہو تو غنیمت ہے۔

اس دور میں ایمان پر قائم رہنے کے لئے غیر معمولی احتیاطی تدابیر اور زیادہ سے زیادہ خلوت کی ضرورت ہے، دنیا میں زیادہ ملوث ہونے سے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے، سادہ طرز زندگی اور کفایت شعاری کی وصف موجود ہو تو اللہ روزی میں برکت

عطافرمائے گااور محتاجی سے بچالیگا،اس کے لئے اللہ سے مستحکم سے مستحکم تعلق قائم رکھناہوگا، بندہ مومن کاایمان اسی سے وابستہ ہے، دنیامیں زیادہ ملوث ہونے سے مادی تہذیب کے اثرات سے بچنامحال تر ہوجائے گا۔

آج سے سوسال پہلے ایک صاحب دل شخصیت نے کہاتھاکہ اب تک توایمان پر قائم رہنا آسان تھا، لیکن اب جو دور آیاہے،اس میں ہر شخص کاایمان محفوظ نہ رہے گا، بلکہ اس کاایمان محفوظ ہوگاجواس کے لئے غیر معمولی مجاہدوں سے کام لے گا، صاحب دل شخصیت کی یہ بات ہمارے دور پر زیادہ لاگو ہوتی ہے۔

ایمان جہاں فرائض وواجبات کامتقاضی ہے، وہاں ایمان دل اور عقل کی سلامتی کا بھی طالب ہے،اس دور میں سب سے زیادہ خطرہ دل اور ذہن کی سلامتی ہی کو لاحق ہے، موبائل پر آدھاگھنٹہ بیٹھنے کے بعد فرد اپنے ایمان کاجائزہ لے گاتو معلوم ہوگاکہ ایمان کی حالت بہت کمزور ہوگئی ہے، وسوسوں نے گھیر لیاہے، فرد بازار چلا گیا، بازار سے واپس آئے گاتووہ اپنے دل میں تاریکی محسوس کرے گا، فرد دنیادار دوستوں کے ماحول میں چلا گیا، ماحول سے واپس آئے گاتووہ اپنے ایمان کو متزلزل محسوس کرے گا، مادی تہذیب کے یہی وہ ہمہ گیر مسموم اثرات ہیں، جس سے اس دور میں لگ بھگ ہر فرد کو سامنا کرنا پڑتاہے، سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔

بس اللہ ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائے۔

نفس اور روح کے درمیان کشمکش کی حالت کاہونا

اللہ نے اس دنیامیں ہر انسان کو نفس اور روح کے ساتھ کشمکش کی حالت میں رکھا ہے، نفس دنیاکاحصول چاہتاہے، خواہشات کی تکمیل چاہتاہے، ہر قسم کی آزادی چاہتاہے اور دوسروں پر برتری چاہتاہے، جب کہ روح اللہ سے وصال کی حالت چاہتی ہے، اللہ سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوناچاہتی ہے،اور اللہ کی رضاکے مطابق زندگی گزارناچاہتی ہے۔

انسان پر جب تک فطرت کے اثرات موجود ہوتے ہیں، تب تک نفس اور روح کے درمیان یہ کشمکش جاری رہتی ہے، لیکن جب فطرت کے اثرات زائل ہونے لگتے ہیں تو یہ کشمکش ختم ہوجاتی ہے، اور نفس کی قوت انسانی شخصیت پر پوری طرح حاوی اور غالب ہوجاتی ہے۔

نفس اور روح کے درمیان اس کشمکش کا خاتمہ انسان کاسب سے بڑاالمیہ ہے،اس لئے کہ اس کشمکش سے ہی نفس پرستی پر خداپرستی کی قوتیں غالب ہونے لگتی ہیں، جب کشمکش ہی ختم ہوگئی توفرد پوری طرح شیطانی قوتوں کے قبضے میں آجاتاہے،اس لئے اس کشمکش کو جاری رکھنا گویاخداپرستی کے سفر کو جاری رکھناہے۔

فرد خواہشات سے مسحور ہوکر، روح کی محبوب سے وصال کے سلسلے میں ساتھ دینے سے فرار کی راہ اختیار کرنے لگتاہے۔

اس طرح فرد ایک تو مقصد زندگی سے محروم ہونے لگتاہے، دوم یہ کہ نفس، روح کو شدید اذیت کی حالت میں رکھتاہے، روح کی اذیت سے دل اور عقل بھی خلفشار کا شکار ہونے لگتے ہیں، تیسرے یہ کہ فرد نفس کی حیرت انگیز قوتوں اور اس کی مکروفریب کی واردات کو سمجھ ہی نہیں پاتااور وہ نفس کے یرغمال شدہ عقل کے زیر اثر رہنے لگتاہے۔

وہ افراد جو اس کشمکش کو جاری تو رکھتے ہیں، لیکن یا تو تھکنے کے احساس کے زیر اثر رہتے ہیں، یا پھر تذبذب کا شکار ہونے لگتے ہیں، ایسے افراد کو سمجھنا چاہئے کہ اللہ نے انہیں نفس پر فتحیابی کا سنہرا موقع عطا فرمایا ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ نفس کے ساتھ کشمکش کی اس حالت کو مستقل مزاجی سے جاری رکھیں، دنیا و آخرت کی ساری کامیابیاں اس کشمکش میں کامیابی سے ہی وابستہ ہیں، دوسری صورت میں دنیا کے طرح طرح کے فتنوں اور آخرت میں عتاب سے بچنا محال تر ہے، قرآن میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ جو اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور خواہشات کو روکتا رہا، اس کے رہنے کی جگہ جنت ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے خاصے لوگ نفس اور روح کے درمیان کشمکش سے بے نیاز ہیں، جس کی وجہ سے وہ فرعون نفس کے زیر اثر زندگی گزار رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کشمکش کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور کامیابی سے سرفراز فرمائے۔

اہل باطل سے دوستی کا سم قاتل ہونا

اس دور کا ایک بڑا مسئلہ اہل باطل اور مادیت پسند افراد سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا ہے، اگرچہ انسانی نوعیت کے تعلقات رکھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے، لیکن جب یہ تعلقات دوستی کی صورت اختیار کرنے لگتے ہیں تو پھر شخصیت پر دوستی کا رنگ چڑھنے لگتا ہے، اور ان کے افکار کا اثر پڑنے لگتا ہے، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اہل باطل سے دوستی فرد کے لئے (اسلامی اعتبار سے) سم قاتل ہے، حدیث شریف ہے کہ فرد دوست ہی کے دین (طریقہ) پر ہوتا ہے، قرآن میں ایک جگہ ہے، **ولاترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔** (ظالموں کے قریب بھی مت پھٹکو ورنہ آگ تمہیں چھوگی)۔

ملت کے ایک دانا مولانا رومی نے فرمایا ہے کہ سانپ کے زہر کا علاج تو ہے لیکن اہل باطل کی دوستی کے اثرات کا کوئی علاج نہیں ہے، اس لئے کہ اس دوستی کے اثرات جسم کے رگ وریشہ میں سما جاتے ہیں اور دل اور ذہن دوست کے لئے مچلنے لگتے ہیں۔

اہل باطل سے دوستی جس نوعیت کی بھی ہو، وہ سخت ضرر رسان ہے۔

مسلم دنیا کے مقتدر طبقات اہل باطل سے دوستی کے معاملات میں بہت آگے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ساری مسلم ریاستیں سیکولرازم سے ہمہ آہنگ ہوگئی ہیں اور اسلام سے ان کا رسمی نوعیت کا تعلق قائم ہے، وہ ریاست کے وسائل کو سیکولرازم کے فروغ کے لئے صرف کر رہی ہیں۔

جدیدیت کی حامل طاقتوں سے دوستی کا مطلب پہلے ذہن کو سیکولر بنانا ہے، اس کے بعد سیکولر طرز عمل کو فروغ دینا ہے، آج کل تقریباً ساری مسلم دنیا کی ریاستوں کا یہی حال ہے۔ پھر دوستی کی وجہ سے اہل باطل کی قوت سے خوف زدگی کا مزاج بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔

اہل باطل سے دوستی کا مسئلہ اسلامی نقطہ نگاہ سے معمولی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ موت وحیات کا مسئلہ ہے، اس لئے کہ اس سے آخرت کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے، بدقسمتی سے اس دور میں آخرت کے نقصان وخسارہ کا احساس مفقود ہوگیا ہے، جس کی وجہ سے دوستی میں احتیاط کا دامن قائم نہیں رہا ہے۔

بد نظری کے اثرات

ذہنوں کو بگاڑ کر دین سے دور کرنے میں جو چیز اہم کردار ادا کرتی ہے وہ بد نظری ہے، یعنی عورت کو دیکھنا یا اس کی تصویر کو دیکھتے رہنا، اس سے ذہن سب سے زیادہ پراگندہ ہوتا ہے اور جنسی خیالات ذہن کا احاطہ کرنے لگتے ہیں، اس طرح ذہن جنسی ہیجان کا شکار ہونے لگتا ہے۔

اس لئے اسلام نے عورت کو دیکھنے اور اس کی تصویر سے سختی سے منع کیا ہے، لیکن بد قسمتی سے موجودہ مادی تہذیب کی بنیاد ہی عورت کی تصویر اور اس کی عریانی کی حالت کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے پر ہے، یہ مادی تہذیب عالمگیر صورت اختیار کر چکی ہے، سوشل میڈیا کے ذریعے اس کے اثرات تیزی سے پھیل رہے ہیں۔

جو چیز ایمان کا حصہ ہے، یعنی بد نظری سے بچنا اور جس چیز سے خیالات کی پاکیزگی وابستہ ہے، اس سے بچنے کا خصوصی اہتمام ہونا، انتہائی ناگزیر ہے، دوسری صورت میں عبادت اور ذکر و فکر کے اثرات کم سے کم تر ہوتے جائیں گے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ بڑے بڑے انبیاء کرام کو تاکید فرماتے ہیں کہ وہ خواہشات سے بچیں اور جو آخرت کو نہیں مانتے ان کی صحبت سے بچیں، **فلا یصدنک عنھا من لایومن بھا واتبع ھواہ فتردٰی۔**

جب انبیاء کرام کو تاکید ہے تو ہمارے لئے تو یہ تاکیدی حکم کئی سو گنا زیادہ بڑھ جاتا ہے جیسا عرض کیا گیا کہ نظر کا فتنہ اس وقت سب سے زیادہ طاقتور فتنہ کی صورت اختیار کر چکا ہے اس کا سب سے بڑا نقصان جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ذہن فکری انتشار کا شکار ہونے لگتا ہے اور عورت کی تصویر کا خاکہ دل اور ذہن سے نکلنے ہی نہیں پایا۔ اس کا دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ دل اور ذہن پر نیکی کے احساسات اور خیالات پر ضرب کاری لگتی ہے۔

یہ دو نقصانات ہی اتنے زیادہ اور سنگین ہیں کہ جو ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں کہ ہم اس فتنے کے قریب بھی نہ جائیں۔ سوشل میڈیا تو نام ہی عورت کے حسن کے مظاہرہ کا ہے، اگرچہ اس کے دوسرے کتنے ہی فوائد ہوں، لیکن یہ نقصان اتنا زیادہ ہے کہ اس کے مقابلے میں سارے فوائد ہیچ ہیں۔

فتنے کو جگانے پر انتباہ

حدیث شریف ہے کہ فتنہ سویا ہوا ہے، جس نے اسے جگایا اس پر لعنت ہو، دوسری حدیث ہے کہ تم فتنوں سے بچو کہ اس میں زبان کا اثر ایسا ہوتا ہے جیسا تلوار کا۔

فتنے سے چونکہ معاشرے میں افراتفری اور فساد پھیلتا ہے، انسان ایک دوسرے سے صف آرا ہوتے ہیں، اس لئے فتنہ برپا کرنے پر سخت نوید سنائی گئی ہے۔

اسلام ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں لوگوں کے باہمی تعلقات محبت کی بنیاد پر استوار ہوں، ایسے معاشرے کے قیام کی راہ میں نفس کی قوت حائل ہے، جو اپنی برتری چاہتی ہے، لگ بھگ ہر انسان کی یہ خاصیت بد ہے کہ وہ اپنی برتری سے کم پر راضی نہیں ہے، اس طرح کی صورتحال میں طیش میں آکر کسی کو مشتعل کرنا، کسی کی عزت پر حملہ آور ہونا، کسی سے دشمنی اختیار کرنا، کسی کو مقابلے کی دعوت دینا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو سوئے ہوئے فتنے کو جگانے کے مترادف ہیں۔

موجودہ دور میں تو تربیت کا ماحول نہ ہونے کی وجہ سوئے ہوئے فتنے باطن میں طاقتور صورت میں موجود ہیں، شخصیت کے جذبات کو ٹھیس پہنچتے ہی وہ غیر معمولی طور پر حساس ہو جاتا ہے اور لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہے، معاشرے میں آئے دن اس طرح کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

اس لئے فتنے کو دبانے کی خاطر ہی سہی، افراد کی تکریم کرنی چاہئے اور دوسروں سے معاملات کے وقت صبر وضبط سے کام لینا چاہئے۔

فتنے کو جگانے والے پر اللہ کے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لعنت کا ہونا، یہ ہمارے لئے سخت انتباہ ہے۔

فتنے میں لسانی، قومیتی اور گروہی و مسلکی عصبیت کو بیدار کرنا، سیاست میں ایک دوسرے سے دشمنی کا ہونا، اختلاف رائے کو دشمنی کا رنگ دینا وغیرہ یہ بھی شامل ہے۔

اس طرح کی اور بھی بہت ساری احادیث ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس کی اصلاح کی کوششوں کے بغیر چارہ کار ہی نہیں، ورنہ فرد کے لئے فتنوں سے بچنا محال تر ہے۔

اپنی تعریف سے بچنے کا اہتمام ہونا

انسان کی نفسیات کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنی تعریف سننا چاہتا ہے، اگر دوستوں یا مجلس میں کوئی اس کی تعریف کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو وہ خود اپنے کاموں کی تعریف کرنا شروع کر دیتا ہے، یہ دراصل خود ثنائی ہے، خود ثنائی کا یہ مزاج ایسا ہے جو خاص طور پر علمی مزاج کے حامل افراد میں بہت مشکل سے بدلتا ہے، خود ثنائی ایسی بیماری ہے جو اعمال کو بھی غارت کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

فرد کی یہ بڑی آزمائش ہے کہ وہ اپنے کردہ کاموں کی تعریف نہ سنے یا اس پر اسے داد نہ دیا جائے۔

اپنے کام اور اپنی شخصیت کے بارے میں نفس بڑی تاویلیں پیش کرتا ہے، لیکن اندر میں غوطہ زنی کرنے والے افراد سمجھتے ہیں کہ اس کا کام اور اس کی خدمات تو کچھ بھی نہیں، اگر اللہ اپنا فضل فرمائے اور اس ٹوٹے پھوٹے کام کی بدولت اس کو اپنے عتاب اور عذاب سے بچالے تو یہ اس کی سب سے بڑی کامیابی شمار ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک نفس کا مسلسل محاسبہ نہ ہو، تب تک نفس اپنی تعریف کے سلسلے میں مچلتا رہتا ہے، خاص طور پر اس سلسلے میں باصلاحیت افراد کی حالت تو قابل رحم ہوتی ہے، جب تک فرد خود احتسابی میں مصروف رہتا ہے، اس وقت تک تو نفس کے یہ جذبات دبے رہتے ہیں، لیکن جوں ہی وہ خود احتسابی کا عمل چھوڑ دیتا ہے، خود ثنائی کا مرض اسے مضطرب کر دیتا ہے۔

مراقبہ ایسی چیز ہے جو خود احتسابی کا کردار ادا کرتا ہے، اس سے فرد نفس کی مکر و فریب کی اس طرح کی واردات سے خبردار اور چوکنا ہو جاتا ہے۔

زندگی مختصر ہے، اگر اس مختصر زندگی میں اللہ کے لئے کام نہ ہوئے، اور دینی کام بھی خود ثنائی کے لئے ہوئے، تو پھر آخرت کی زندگی تو ناکامی سے عبارت ہوگی، اس لئے سخت محتاط ہونے اور سنبھلنے کی ضرورت ہے۔

عام طور پر اس طرح کی بیماریوں سے بچاؤ کے لئے مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے، اس کے بغیر خود ثنائی جیسی بیماریوں سے بچاؤ مشکل ہوتا ہے۔

ایمان کی زیر و زبر کی حالت کا ہونا
حدیث شریف کی روشنی میں

اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت سے پہلے فتنے تاریک رات کی طرح ہوں گے، فرد صبح کو مومن ہوگا تو شام کو کافر اور پھر صبح کو کافر۔

اس حدیث میں آخری وقت میں ایمان کی تیزی سے بدلتی ہوئی حالت کا ذکر بیان فرمایا گیا، اس کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں کہ جدید آلے جس میں دنیا بھر کی بُرائی موجود ہے، جس سے ذہن اور دل بُری طرح متاثر ہوتا ہے، وہ عام ہو گیا ہے اور اس کا استعمال بھی بہت زیادہ بڑھ گیا ہے، بچہ ہو، عورت ہو یا مرد، وہ اس آلے کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اس آلے میں ایسا سحر موجود ہے کہ فرد کے پاس جو بھی وقت بچتا ہے، وہ موبائل کے ساتھ گزارتا ہے اور وہ اپنوں سے ایک طرح سے بے گانہ ہو گیا ہے، اس لئے موبائل میں فحش مناظر دیکھنے کے لئے وہ بے چین رہنے لگتا ہے، اس آلے نے جنسی جذبات میں سخت ہیجان خیزی پیدا کر دی ہے، معلوم نہیں آنے والے حالات میں اس سے زیادہ خطرناک قسم کے آلات وجود میں آسکتے ہیں، اس آلے نے تو اہل ایمان کی آنکھیں کھول دی ہیں کہ اس تیز رفتاری سے کروڑہا انسانوں کے دل اور ذہن کو بھٹکانے والا آلہ بھی ایجاد ہو سکتا ہے۔

اگرچہ ابھی اس حدیث شریف کے ظاہر ہونے کا وقت پوری طرح سامنے نہیں آیا، لیکن مادی تہذیب کے غلبے اور مادی نوعیت کے جدید آلات نے اس کے لئے حالات سازگار کرنا شروع کر دیئے ہیں۔

اس آلے میں آزمائش کا یہ پہلو بھی شامل ہے کہ اس سے روزمرہ زندگی کی متعدد ضروریات وابستہ کر دی گئی ہیں، خاص طور پر ملازمت پیشہ اور تجارت پیشہ افراد کی۔ لیکن

چونکہ اس آلے میں خواہشات کی لذت کا بے شمار سامان رکھا گیا ہے، جو ایمان کو زیر وزبر کرنے والا ہے، جس سے دستبردار ہونا محال تر ہے۔

یعنی ضروریات بھی ہیں تو ساتھ ساتھ لذت کا سامان بھی۔

اس آلے کو چھوڑتے ہیں تو کام متاثر ہوتے ہیں اور مشکلات درپیش ہوتی ہیں، اگر نہیں چھوڑتے اور رکھتے ہیں تو اس میں محویت کی وجہ سے خواہشات میں مبتلا ہوتے ہیں، جس سے ایمان زیروزبر ہوتا ہے۔

مادہ پرستی کی فضا نے لوگوں کو یا تو معاشی مجبوریوں میں اس طرح مبتلا کر دیا ہے کہ ان کے پاس معاش کی فکر کے علاوہ دین کی فکر کے لئے وقت ہی نہیں ہے یا پھر لوگ معاشی خوشی کے جنون میں مبتلا ہیں، آخرت کی فکر ندارد۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے مذکورہ حدیث شریف پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث شریف کے آثار ظاہر ہوگئے ہیں، ایمان زیروزبر ہونا شروع ہوا ہے اور دنیا پرستی کے میلات کو بھی فروغ ملا ہے۔

اس وقت عالمی اقتدار بے خدا تہذیب کے علمبرداروں کا ہے، انسانیت پر تیزی سے ان کی گرفت بڑھتی جارہی ہے، مسلم ممالک میں بھی بظاہر تو حکومت دوسروں کی ہے، لیکن اصل حکمرانی مادی تہذیب کے علمبرداروں کی ہے، جو بے خدا تہذیب کو پروان چڑھا رہے ہیں، جس سے ان کے اپنے زبردست مفادات وابستہ ہیں، ان حالات میں ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ہم اپنے اور اپنی نسلوں کے ایمان کے تحفظ کے لئے کوشاں ہوں۔

مال کی خصوصیات

اور اس کے مضر پہلو

مال سے اتنا تعلق ہونا کافی ہے، جس سے اپنی ضروریات بہتر طور پر پوری ہو سکیں، اگر مال کے لئے راہیں کشادہ ہونے لگیں تو فرد کو ہمت کا مظاہرہ کر کے ان راہوں پر چلنے سے انکار کرنا چاہئے، اس لئے کہ اس سے مال سے مزید مال بنانے کے جنون سے بچنا دشوار ہوگا۔

جو مالدار مال کمانے کی کوششوں کے دوران نماز کی فکر رکھتے ہیں، ضرورتمندوں کی دل کھول کر مالی معاونت کرتے ہیں، دینی اداروں اور دعوتی نوعیت کی شخصیتوں کی مدد کرتے ہیں، اسلام کے لئے حساسیت کے حامل ہیں، ناجائز طور طریقوں سے مال نہیں کماتے ایسے افراد بظاہر تو مالدار ہیں، لیکن حقیقت میں وہ مالدار نہیں ہیں، بلکہ وہ دنیا سے بے نیاز افراد میں شمار ہوں گے، ایسے افراد کی فطرت سلیمہ کی حفاظت اور بہتر تربیت کی وجہ سے ان کو مال میں مصروفیت کے باوجود مال سے بے نیازی کی خصوصیت عطا فرمائی گئی ہے، چونکہ افراد اور ملت کی ضروریات ایسی ہیں، جو مال کی متقاضی ہیں، اس لئے ایسے افراد دینی ودعوتی اداروں اور غریبوں کے لئے ظاہری سہارے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اصل سہارا تو اللہ کی ذات ہے، لیکن یہ اس کا ذریعہ ہیں اس لئے ایسے افراد قابل قدر اور قابل ستائش ہیں، دینی ودعوتی اداروں کی طرف سے ہونے والے کام اور اس کے اجر میں وہ پوری طرح شریک ہیں۔

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی بڑی فضیلت ہے، اس سے فرد کے تزکیہ کی بھی ایک حد تک صورت پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ عام طور پر ہر مالدار کا دل مال میں اٹکا ہوا ہوتا ہے، مال کو اللہ کے لئے خرچ کرنے سے دل اور نفس کی اس حالت میں تبدیلی آنے لگتی ہے، کہتے ہیں کہ جہاں مال ہوتا ہے، دل بھی وہیں ہوتا ہے، مال اگر اللہ کی راہ میں صرف ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد کا دل اللہ اور اسلام کے لئے یکسو ہے، ایسے افراد کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ؟ لیکن معاشرے میں دل کے سخی ایسے افراد کم ہی ہوتے ہیں، مال عام طور پر جس مزاج کے لوگ تیار کرتا ہے، وہ دنیا سے محبت کرنے والے لوگ ہیں، اس لئے اللہ کے رسول ﷺ

نے فرمایا کہ مجھے اس بات کا خطرہ نہیں ہے کہ تمہارے ہاں غربت آئے گی، بلکہ خطرہ اس بات کا ہے کہ تمہارے ہاں مال آئے گا پھر تم فتنوں میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

مال کی بہتات کی خاصیت بد یہ ہے کہ دل سخت ہو جاتا ہے اور فرد اصلاح کے حوالے سے بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا، دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ مال جمع کرنے کی حرص میں اضافہ ہونے لگتا ہے، تیسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ مستحق افراد پر مال خرچ کے لئے دل آمادہ نہیں ہوتا، چوتھا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اور پوری زندگی مال کے تفکرات اور مال کی تگ ودو میں ہی صرف ہونے لگتی ہے، فرد مرتا ہے تو وہ خالی ہاتھ قبر میں جاتا ہے، پانچواں نقصان یہ ہوتا ہے کہ غریبوں کو یا مالی مدد کی تقاضا کرنے والوں کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔

مال کو مقصود سمجھنے یا اس میں محویت اور فنائیت کے کتنے بڑے نقصانات ہیں جن کا ذکر کیا گیا۔

یہ جس مال کے نقصانات بیان ہوئے وہ کثرت مال ہے، تھوڑا بہت مال تو ہر فرد کی ضرورت ہوتی ہے، ضرورت کے لئے مال کی جدوجہد مستحسن بات ہے، اسلام اس کی تاکید کرتا ہے۔

موجودہ دور میں مال بڑی نعمت ہے کہ اس کی وجہ سے دین محفوظ ہے، عزت محفوظ ہے اور سیکولر قوتوں کی محتاجی سے بچاؤ کی صورت ہے۔

چونکہ کثرت مال سے طاقت حاصل ہوتی ہے، لوگوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی صورت پیدا ہوتی ہے اور ساہوکار آپس میں ملی بھگت کر کے حکومت پر بھی نہ صرف اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ درون خانہ رہ کر حکومت کی ساری پالیسیاں وہ اپنے مفادات کے تحت بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں، اس لئے مال کی بہتات سے روکا گیا ہے کہ اس سے فتنوں میں مبتلا ہونے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

اللہ کی خاطر گوشہ نشینی اختیار کرنا

صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندہ سے محبت رکھتا ہے جو متقی ہوا (دل کا) غنی ہو اور گم نام (یعنی گوشہ نشین) ہو۔

اللہ کی خاطر گوشہ نشینی ایسی چیز ہے جو فرد کی زندگی کو بنانے میں کردار ادا کرتی ہے، اس حدیث شریف میں تقویٰ اور دل کے غنی ہونے کا بھی ذکر ہے، لیکن ہم یہاں صرف گوشہ نشینی پر گفتگو کریں گے۔

گم نامی اور گوشہ نشینی کا مطلب دنیاوی نوعیت کے تعلقات کم کر کے، اللہ کے لئے یکسو ہو جانا ہے یہ چیز (گوشہ نشینی) سے ہی حاصل ہوتی ہے، گوشہ نشینی کے بہت سارے فوائد ہیں• شہرت (جو بہت بڑا فتنہ ہے) اس سے بچنے کی صورت پیدا ہوتی ہے، •عبادت اور ذکر وفکر کے لئے زیادہ وقت ملتا ہے، جس سے روح کو تسکیں ملتی ہے •فرد غیر ضروری کاموں، اور غیر ضروری باتوں سے بچ جاتا ہے •اعمال کے لئے اعضائے جسم میں قوت پیدا ہوتی ہے • زیادہ مادی مصروفیات اور دنیاوی الجھنوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

•گلا غیبت، کثرت گوئی (زبان درازی) سے حفاظت ہوتی ہے •مادی نوعیت کے مسائل کی وجہ سے جو تفکرات اور ذہنی خلفشار پیدا ہوتا ہے، فرد اس سے بچ جاتا ہے۔

• گوشہ نشینی بندہ مومن کو اللہ سے محبت پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے • گوشہ نشینی سے دل اور روح خوشی ومسرت کے احساسات سے جگمگانے لگتے ہیں • بالخصوص فتنوں کے دور میں گوشہ نشینی سے بہت سارے گناہوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

ایسی گوشہ نشینی جس سے جدید آلات ذریعہ فرد بُرائی کے منظروں سے محظوظ ہوتا رہے، یہ گوشہ نشینی بڑا وبال ہے۔

گوشہ نشینی سے مقصود اللہ کے دھیاں کے ذریعہ اللہ سے قریب سے قریب تر ہونا ہے، ایسی گوشہ نشینی کے جتنے بھی فوائد بیان کئے جائیں کم ہیں، اس طرح کی گوشہ نشینی سے اگر شہرت حاصل ہوتی ہے تو یہ شہرت انعام ہوتی ہے۔

خوارج کو سمجھنے کی ضرورت

اسلام کے نام پر اسلام سے جداگانہ راستہ

احادیث میں خارجیوں (خوارج) کا ذکر آتا ہے، جو حضور ﷺ کے وصال کے بعد ظاہر ہوئے، جنہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کے دور میں صحابہ کرام سے جنگ کی۔

بعد میں بھی یہ خوارج موجود رہے اور اسلام کے نام پر فتنہ وفساد برپا کرتے رہے، حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ خوارج قیامت تک موجود رہیں گے۔

احادیث میں خوارج کی جو نشانیاں بتائی گئی ہیں، ان میں سے کچھ نشانیاں یہ ہیں (۱) نوعمر ہوں (۲) دماغی طور پر ناپختہ ہوں گے (۳) ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا (۴) وہ بظاہر بڑی اچھی باتیں کریں گے (صحیح بخاری) یعنی دینی نعرے بلند کریں گے اور اسلامی مطالبے کریں گے۔

(۵) وہ اہل اسلام کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے (صحیح بخاری (۶) وہ قرآن پڑھیں گے اور سمجھیں گے کہ وہ ان کے حق میں ہے، حالانکہ وہ ان کے خلاف (صحیح مسلم) حقیقت یہ ہے کہ وہ مخلوق کے بدترین لوگ ہوں گے، (سنن نسائی) ان کے سجدوں پر تم رشک کروگے۔

خوارج کی شروعات اس طرح ہوئی کہ ایک صاحب نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا آپ ہمیں صدقہ کا مال دیں، آپ انصاف نہیں کرتے، اس پر حضرت رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یارسول اللہ مجھے اجازت دیں کہ میں ان کی گردن اڑادوں، آپ نے فرمایا، نہیں، ان کے گروہ سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جن کے قرآن پڑھنے پر تم رشک کروگے، لیکن وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے، جس طرح تیر کمان سے نکلتا ہے۔

خوارج اسلام کے نام پر قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے اور وہ دوسروں کے بجائے مسلمانوں ہی سے ہی صف آرا ہوں گے، اس لئے کہ کہ وہ سمجھیں گے کہ اسلام کا ان کا خود ساختہ تصور ہی صحیح اور حرف آخر ہے، ان سے ہٹکر باقی مسلمان باطل پر ہے، اس لئے ان

کے خلاف ان کی زبانیں تیز چلیں گی، اگر ان کو طاقت حاصل ہوگی تو وہ مسلمانوں سے لڑیں گے۔

خوارج کو جن چیزوں نے گمراہ کیا، ان میں ایک چیز تو اپنے افضل اور بڑے پن کا جذبہ ہے ان کی دوسری خرابی یہ تھی کہ وہ بری طرح اعتراض کی نفسیات میں مبتلا تھے، وہ صحابہ کرام پر بھی معترض تھے کہ انہوں نے اسلام کی حقیقت کو نہیں سمجھا، اسلام کی اصل حقیقت کو تو ہم نے سمجھا ہے، اعتراض کی نفسیات نے ان میں ضد کی حالت پیدا کردی تھی۔

ان میں تیسری خرابی یہ تھی کہ بڑے پن کے جذبہ نے ان کی دماغی حالت کو کمزور کردیا تھا، اس لئے صحابہ کرام سے جنگ کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ ہمت سے آگے بڑھو اور شہادت اور جنت کے لئے تیار ہو جاؤ۔

موجودہ دور میں یہ طبقہ موجود ہے، اور اس میں یہی تین خرابیاں موجود ہیں، قرآن سے اور نماز سے تو ان کا گہرا تعلق ہے، اسلام کی تبلیغ کو بھی انہوں نے اپنا مشن بنایا ہوا ہے، لیکن وہ ایک تو سلف صالحین کی اسلامی تشریح کے منکر ہیں اور اپنے مقابلے میں ان کو کچھ بھی نہیں سمجھتے، دوسرے یہ کہ انہوں نے قرآن کی خود ساختہ تشریح کی ہے، کئی جلدوں پر مشتمل قرآن کی تشریح کی ہے، تیسرے یہ کہ وہ اپنے علاوہ سارے مسلمانوں کو نہ صرف گمراہ سمجھتے ہیں، بلکہ انہیں مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔

اسلام کے نام پر یہ گروہ سرگرم عمل ہے اور ہمارے ارد گرد موجود ہے اور ہمیں اس سے بچ کر چلنا ہے، اور ان کی اسلامی فکر کی گمراہیانہ حیثیت کو سمجھنا ہوگا۔

یہ نکتہ سمجھنا انتہائی ضروری ہے کہ صحابہ کرام اور سلف صالحین کی قرآن وسنت کی فکر بہت بڑی نعمت ہے، اس فکر کو مضبوطی سے تھامے رہنا انتہائی ناگزیر ہے، دوسری صورت میں اسلام کے نام پر گمراہی کے پھاٹک کھلتے رہیں گے اور فرد زندگی بھر ان سے نکلنے نہیں پائے گا، اور مذکورہ احادیث کا مصداق بن جائے۔

اللہ ہمیں صحیح اسلامی فکر اور بزرگان دین کی اسلامی فکر کو تھامے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔